مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک سو سالہ قدیم یادگار اور پہلی تالیف، جو ماہ نامہ القاسم دیوبند میں قسط وار شایع ہوئی تھی، پہلی مرتبہ کتابی صورت میں آپ کے ہاتھ میں ہے، جس میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا حکم، اہمیت اور فوائد بیان کیے گئے ہیں

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

مع تسہیل

یادگار اور پہلی تالیف

حضرت مولانا محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مفتی اعظم پاکستان

تلاش وجستجو، تدوین وترتیب

قاری تنویر احمد شریفی

خطیب جامع مسجد سٹی اسٹیشن، کراچی

مکتبہ رشیدیہ کراچی

اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ
كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ
اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ
اللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ
كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ
اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا محمد شفیع صاحبؒ کی ایک سو سالہ قدیم یادگار اور پہلی تالیف، جو ماہ نامہ القاسم دیوبند میں قسط وار شایع ہوئی تھی، پہلی مرتبہ کتابی صورت میں آپ کے ہاتھ میں ہے۔ جس میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا حکم، اہمیت اور فوائد بیان کیے گئے ہیں

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

یادگار اور پہلی تالیف

حضرت مولانا محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مفتی اعظم پاکستان

تلاش وجستجو، تدوین وترتیب

قاری تنویر احمد شریفی

خطیب جامع مسجد سٹی اسٹیشن، کراچی

مکتبہ رشیدیہ کراچی

کتاب : امر بالمعروف ونہی عن المنکر
تالیف : مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ
مرتب : قاری تنویر احمد شریفی
پہلی اشاعت : شعبان المعظم ۱۴۳۷ھ/مئی ۲۰۱۶ء
اہتمام : حافظ محمد اشہد شریفی
ناشر : مکتبہ رشیدیہ
بالمقابل مقدس مسجد، اردو بازار کراچی 74200
فون: 32767232-9221+
برقی پتا : maktabarasheedya@gmail.com

پاکستان کے ہر اچھے اور باذوق مکتبے سے یہ کتاب مل سکتی ہے۔

فہرست مضامین

کلماتِ مرتب

اللہ رب العزت کا بے انتہا شکر ہے کہ اس نے یہ نعمت بھی عطا فرمائی کہ اپنے اکابر اور علماے دیو بند کی عظیم الشان تحریری خدمات کو عام کرنے کا ذوق دیا۔ یہ میرے اساتذہ کرام بالخصوص میرے جد امجد حضرت مولانا قاری شریف احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی تربیت اور دعاؤں کا ثمرہ ہے۔ حضرت قاری صاحب علیہ الرحمہ کو یہ ذوق اپنے اساتذہ: مفتی اعظم حضرت علامہ محمد کفایت اللہ دہلوی اور افضل المفسرین حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی قدس سرہما سے ملا تھا۔

راقم الحروف نے شعبان المعظم ۱۴۳۵ھ/ جون ۲۰۱۴ء سے سالانہ کتابی سلسلہ ''یادگار اکابر'' شروع کیا، جس میں پیش نظر یہ ہے کہ ہمارے بزرگوں کے وہ مضامین جو شائع ہو کر نایاب ہو گئے، انھیں باذوق قارئین تک پہنچا کر محفوظ کرنے کا فرض کفایہ ادا کیا جائے۔ تا وقت تحریر دو سلسلے: پہلا اپنے اکابر و علما کے نایاب مختلف مضامین ومقالات پر اور دوسرا حجۃ الاسلام حضرت امامنا مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کی یاد میں نمبر کی حیثیت سے شائع ہو چکا ہے، اور ایک ماہ تک تیسرا سلسلہ مختلف مضامین پر آرہا ہے۔ ''یادگار اکابر'' ان شا اللہ تعالیٰ سال بہ سال شائع ہوتا رہے گا۔ اس سال نامے کے لیے جب مضامین کی تلاش کی گئی تو جہاں بہت سے مضامین پر نظر پڑی وہیں زیر نظر کتاب کے مضمون پر بھی نظر ٹک گئی۔ میں نے اس کا عکس بنوالیا۔ یہ مضمون ''مولوی محمد شفیع صاحب، مدرس مدرسۂ دیو بند'' کا تھا، جنھیں اللہ تعالیٰ نے تقسیمِ ملک کے بعد ''مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا محمد شفیع صاحبؒ'' بنا دیا۔ آپ

ایک جید عالم اور فقیہ تھے۔

یہ مضمون: ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' تیرہ اقساط میں ''مدرسۂ عربیہ دیوبند'' (دارالعلوم دیوبند) کے ترجمان ماہ نامہ ''القاسم'' دیوبند میں شائع ہوا۔ اس کی اشاعت کی تفصیل پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

پہلی قسط ذوالحجہ ۱۳۳۵ھ/ستمبر ۱۹۱۷ء میں صفحہ ۱ سے صفحہ ۸ تک،

دوسری قسط محرم الحرام ۱۳۳۶ھ/اکتوبر ۱۹۱۷ء میں صفحہ ۹ سے ۱۶ تک،

تیسری قسط صفر المظفر ۱۳۳۶ھ/نومبر ۱۹۱۷ء میں صفحہ ۹ سے صفحہ ۱۶ تک،

چوتھی قسط ربیع الاول ۱۳۳۶ھ/دسمبر ۱۹۱۷ء میں صفحہ ۲۵ سے صفحہ ۳۲ تک،

پانچ ویں قسط ربیع الثانی ۱۳۳۶ھ/جنوری ۱۹۱۸ء میں صفحہ ۲۵ سے صفحہ ۳۲ تک،

چھٹی قسط جمادی الاولیٰ ۱۳۳۶ھ/فروری ۱۹۱۸ء میں صفحہ ۲۵ سے صفحہ ۳۲ تک،

سات ویں قسط جمادی الثانی ۱۳۳۶ھ/مارچ ۱۹۱۸ء میں صفحہ ۲۵ سے صفحہ ۳۲ تک،

سات ویں قسط کے بعد پندرہ ماہ تک آٹھ ویں قسط نہیں آئی۔

آٹھ ویں قسط شوال المکرم ۱۳۳۷ھ/جولائی ۱۹۱۹ء میں صفحہ ۹ سے ۱۲ تک،

نویں قسط ذوالقعدہ ۱۳۳۷ھ/اگست ۱۹۱۹ء میں صفحہ ۱۹ سے صفحہ ۲۴ تک۔

ذوالحجہ میں خاموشی رہی۔

دس ویں قسط محرم الحرام ۱۳۳۸ھ/اکتوبر ۱۹۱۹ء میں صفحہ ۱۷ سے صفحہ ۲۴ تک۔

صفر المظفر میں پھر خاموشی رہی اور گیارھویں قسط شائع نہیں ہوئی۔

گیارھویں قسط ربیع الاول ۱۳۳۸ھ/دسمبر ۱۹۱۹ء میں صفحہ ۳ سے صفحہ ۸ تک۔

اس کے بعد پھر تین ماہ کوئی قسط نہیں چھپی۔

بارھویں قسط رجب المرجب ۱۳۳۸ء/مارچ ۱۹۲۰ء میں صفحہ ۲۵ سے صفحہ ۳۲ تک

اس کے بعد پھر نو ماہ خاموشی رہی۔

تیرھویں اور آخری قسط جمادی الثانی ۱۳۳۹ھ/ فروری ۱۹۲۱ء میں صفحہ ۱ سے صفحہ ۱۹ تک ہے۔

تیرھویں قسط کی ابتدا میں حضرت مفتی صاحبؒ نے لکھا ہے:

''مدت کے بعد آج پھر بھولا ہوا مشغلہ یاد آیا۔''

یہ مضمون رسالہ القاسم کے ایک سو سات صفحات پر مشتمل تھا۔ آج سے ایک سو دو سال پہلے حضرت مفتی صاحبؒ نے لکھنا شروع کیا تھا اور تقریباً چار سال میں ۵ رمضان المبارک ۱۳۳۹ھ/ ۱۳ مئی ۱۹۲۱ء میں یہ تحریر مکمل ہوئی، لیکن یہ آخری قسط چھپی تو فروری ۱۹۱۲ء کے شمارے میں۔ یہ فرق تاریخ کا کیسے آیا؟ بہت غور و فکر کے بعد یہ بات سمجھ میں آئی کہ اس دور میں کاغذ کی گرانی بہت تھی۔ کبھی ملتا نہیں تھا اور کبھی بہت مہنگا ہوتا تھا، جیسا کہ اس زمانے کے رسایل دیکھنے سے اس کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے ہوسکتا ہے کہ ''القاسم'' کے سلسلے تاخیر کا شکار ہو گئے ہوں، فروری ۱۹۱۲ء کا شمارہ مئی ۱۹۲۱ء میں چھپا ہو اور مہینہ اس پر فروری ہی رہا ہو، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کتابت کی غلطی سے ۱۲ کے بجائے ۲۱ لکھا گیا ہو۔ واللہ اعلم!

اس طرح یہ مضمون ایک سو سال قدیم ہے، اور اس سے میری یہی دلچسپی ہے۔ مضمون جب اتنا قدیم ہے تو اس کی قسطوں کی تلاش میں کتنی دشواریاں پیش آئی ہوں گی؟ اس کا اندازہ باذوق افراد کو ہوگا۔

زیر نظر مضمون کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ حضرت مفتی صاحبؒ نے دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہونے کے تین ماہ بعد اس کو لکھنا شروع کیا۔ اس لیے میرا خیال یہ ہے کہ حضرت مفتی صاحبؒ کی پہلی تالیف یہی ہے، اس لیے بھی یہ تحریر ایک

یادگار ہے۔ ابتدا میں مصنف اور مولف کا لکھنے کا انداز بالکل الگ ہوتا ہے، پھر تجربات سے گزرنے کے بعد قلم اور تحریر دونوں پختہ ہو جاتے ہیں۔ اس تحریر میں اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ نے تحریر کا ذوق دیا تھا، اور ساتھ ہی آپ کی تصنیفات و تالیفات کو مقبولیت بھی عطا ہوئی۔ حضرت مفتی صاحبؒ کی تالیفات و تصنیفات میں زیر نظر مضمون یا کتاب کا نام تو ملتا تھا، لیکن کتاب کی شکل میں کہیں نہیں تھی۔ اس لیے جب مجھے یہ مضمون ملا تو داعیہ پیدا ہوا کہ اسے مدون و مرتب کر دیا جائے۔ اللہ کے نام کے ساتھ اس کا کام شروع کر دیا۔ دوران ترتیب حضرت مفتی صاحبؒ کی خواب میں زیارت ہوئی بھی۔ یہ میرے لیے ایک سعادت ہے۔

اب یہ کتاب آپ کے سامنے ہے اور اس میں جو کام کیا گیا ہے وہ یہ ہے:

- اس کے ابواب قایم کیے گئے ہیں۔
- ابواب پر مرکزی عنوان اور باب میں جابجا ذیلی عنوان قایم کیے گئے ہیں۔
- جہاں وضاحت کو ضروری سمجھا گیا وہاں حاشیہ تحریر کیا گیا ہے۔
- جہاں تک ہو سکا اپنے ناقص علم کے مطابق مشکل الفاظ کے معانی قوسین میں لکھے گئے ہیں۔

اس طرح یہ کتاب پہلی مرتبہ کتابی صورت میں آپ کے سامنے ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے حضرت مفتی صاحبؒ، مرتب، ناشر اور ہر ایک قاری کے لیے باعث نجات بنائے۔ آمین بحرمۃ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم!

تنویر احمد شریفی عفی عنہ

۲۰؍رجب المرجب ۱۴۳۷ھ

۲۸؍اپریل ۲۰۱۶ء

تمہید

گرت نہی منکر بر آید زدست
نہ شاید چو بے دست و پایاں نشست
چو دست و زباں رانماند مجال
بہمت نما یند مردی رجال

انسان آزاد فطرت ہے

انسان بلکہ تمام حیوانات خلقتاً آزاد طبع پیدا کیے گئے ہیں۔ان کی طبیعت آزادی پر مجبول (پیدا کی گئی) ہے۔ان کی طبعی خواہش اور دلی رغبت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی کہ آزادورہ کر زندگی بسر کریں۔ان کی تمام رغائب (خواہشات) کا خلاصہ اس سے تجاوز نہیں کرتا کہ ان کو آزادی دی جائے۔شتر بے مہار کی طرح جب چاہیں اور جہاں چاہیں چلے جائیں اور جہاں چاہیں نہ جائیں۔جب تک خواہش ہو بیٹھے رہیں اور جب چاہیں لیٹ جائیں۔جس وقت تک جی چاہے سوتے رہیں اور جب چاہیں اُٹھ بیٹھیں۔جس چیز کو طبیعت چاہے کھائیں اور جو چاہیں پئیں،کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ ہو۔ان کی نظروں میں جنت اس سے زیادہ کچھ معنی نہیں رکھتی کہ ان کے افعال پر کچھ داروگیر نہ ہو۔کوئی پوچھنے والا نہ ہو کہ تم نے کیا کیا اور کیوں کیا:۔

بہشت آں جا کہ آزارے نہ باشد
کسے رابا کسے کارے نہ باشد

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ گھوڑے اور بار برداری کے جانوروں کو جس وقت سواری اور بار برداری میں لیا جاتا ہے، ان کی بچپن کی ملی ہوئی آزادی کو قیود کے بوجھ سے بدلنا چاہتے ہیں تو کتنی مشاق کا تحمل کرنا پڑتا ہے اور کتنی محنتوں سے ان کو رام کیا جاتا ہے اور وہ اس سے کتنے بھاگتے ہیں؟ اُس سے جان چھڑانے کے لیے اپنے نزدیک وہ کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے۔ وحشی جانوروں کی طرح بھاگتے ہیں۔ چار طرف ہاتھ پیر مار کر قیود کو توڑ پھوڑ کر نکلنے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر رام و مطیع ہو جانے کے بعد بھی وہ اُس وقت تک کوئی کام انجام نہیں دے سکتے جب تک کہ ان کے پیروں پر سایق و قاید (ہنکانے اور لے جانے والا) کا انکس (عاجزی) اور اُن کی ناک میں نکیل یا منہ میں لگام نہ ہو۔ اس طرح حضرت انسان بھی آزاد طبع، آزادی پسند ہیں۔ ان پر کسی کی اطاعت و فرماں برداری اس سے زیادہ شاق ہوتی ہے کہ ان کے سر پر منوں بوجھ رکھ دیا جائے۔ ان پر کسی کے حکم کا تابع ہونا تمام مشاق و مصایب سے بڑھ کر ہے۔ اپنی خوشی سے صبح سے شام تک ایک جگہ بیٹھے رہیں تو کوئی تعب و مشقت (تکان) لاحق نہیں ہوتی۔ کوئی اُٹھانا بھی چاہے تو نہیں اُٹھتے، اور اگر ان کو یہ معلوم ہو جائے کہ ہمیں ایک گھنٹے تک حکماً یہیں بیٹھا رہنا ہوگا، حاکم کا پہرہ ہم پر مسلط ہے، تو تجربہ شاہد ہے کہ ایک گھنٹہ گزارنا ان پر پہاڑ ہو جاتا ہے۔ سچ ہے: الانسان حریص علی ما منع!

آزاد- مذہب کے تابع کیسے ہو سکتا ہے؟

بھلا پھر ایسے آزاد منش سے کیسے ممکن تھا کہ کسی مذہب کے احکام کا مقید یا کسی

دین وملت کے قواعد میں پابہ زنجیر ہو جائے؟ اس کا فعل کسی مذہبی معیار پر جانچا جائے
اور ہر قول دینی سانچے میں ڈھالا جائے؟ اس کو:

اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا ○ (سورۂ بنی اسرائیل:۳۶)

''البتہ انسان کے کان اور آنکھ اور دل سب کا حساب لیا جائے گا۔''

کی بھاری زنجیروں میں جکڑ دیا جائے، اور:

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ ○ (سورۂ ق:۱۸)

''کوئی قول نہیں بولا جاتا بغیر اس کے کہ اُس کے پاس ایک نگہبان فرشتہ مقرر ہوتا ہے (تا کہ وہ اس کو لکھ لے)۔''

کی سخت اور گراں قید میں مقید کر دیا جائے، اور اس کو:

اِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ

(سورۂ انفطار:۱۰تا۱۲)

''البتہ تم پر چند حفاظت کرنے والے کریم الطبع فرشتے مسلط ہیں، جو (تمہارے اعمال) لکھنے والے ہیں، تم جو کچھ کرتے ہو وہ اس کو دیکھتے ہیں۔''

کے قوی پہرے میں نظر بند کر دیا جائے۔ اس کے تمام حرکات وسکنات، نشست و برخاست اور عمر بھر کے اقوال وافعال سب کا حساب لیا جائے، جیسا کہ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا تزول قدما ابن آدم يوم القيامة حتى يسأل عن خمس عن عمره فيما

افناه و عن شبابه فیما ابلاه و عن ماله من این اکتسبه و فیما انفقه و ما ذا عمل فیما علم۔ (مشکوٰۃ المصابیح)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن آدمی کے قدم اس وقت تک (اپنی جگہ سے) نہ ہل سکیں گے جب تک اُس سے پانچ چیزوں کا سوال نہ کرلیا جائے: ایک عمر کا کہ اس کو کس کام میں فنا کی؟ دوسرے جوانی کا کہ اس کو کس کام میں پرانا کیا؟ اور تیسرے مال کا کہ کہاں سے کمایا؟ اور چوتھے یہ کہ کہاں خرچ کیا؟ پانچویں یہ کہ علم پر کیا عمل کیا؟''

انسان آزاد فطرت ہونے کے باوجود پابند:

تو جیسا کہ اُن جانوروں کو رام اور مطیع کرنے اور اُس سے کام لینے کے لیے اُن کو سدھانے والے اور سایق و قاید کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح اس آزادی پر مرمٹنے والے کے لیے ان سے زیادہ اس کی ضرورت تھی۔

اس لیے اللہ تعالیٰ (جلّت قدرتہٗ و عظمت حکمتہٗ) نے اس کے سدھانے کے لیے انبیا علیہم السلام کو مبعوث فرمایا کہ اس کے نفس سرکش کی ناک میں مذہب کی نکیل اور اس کے منہ میں اتباع خدا اور رسول کا لگام ڈال دیں۔ ان کو معروفات (اچھے کاموں) کا امر کریں، اور جو عند اللہ محبوب ہوں، اور منکرات (بری باتوں) سے روک دیں، اور اُسے آگاہ کردیں کہ:۔

جو بندہ ہے تو مزہ بندگی میں پیدا کر
نہیں وہ بندہ جسے ذوق ہو رہائی کا

انبیا علیہم السلام راستہ دکھا گئے:

پھر جیسا کہ گھوڑے کا سدھانے والا اُس کو سدھا کر اُس کی باگ مالک یا سائیس (گھوڑے کی خدمت کرنے والا) کے ہاتھ میں دے کر رخصت ہو جاتا ہے، اب اُس سے کام لینا اور منزل مقصود کی طرف لے جانا اس کا کام ہوتا ہے۔ اگر سوار اچھا ہوتا ہے گھوڑا تیز چلتا ہے اور جلد منزل مقصود پر پہنچ جاتا ہے، ورنہ پھر جو اس کی گت بنتی ہے وہ سب پر عیاں ہے۔

اسی طرح انبیا علیہم السلام اپنی اپنی شریعت کی صاف اور سیدھی شاہراہ لوگوں کے دکھا کر رخصت ہوے اور اُن کی انتظامی باگ اپنے وُرثا علما اور اولیا آمرین بالمعروف والناھین عن المنکر (اچھی باتوں کا امر کرنے والے اور بُری باتوں سے منع کرنے والے) کے ہاتھ میں دی۔ اب جس اُمت میں آمرین بالمعروف بہ کثرت ہوے اُس مذہب کی اشاعت زیادہ ہوئی، اور جس قدر مضبوطی کے ساتھ انہوں نے اپنے فریضۂ منصبی (امر بالمعروف) کی باگ تھامی اسی قدر اُس مذہب کی بنیاد مستحکم ہوئی۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک روایت اس مضمون کو بہ وضاحت بیان کرتی ہے:

عن ابن مسعود قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ما بعث اللّٰہ نبیاً الاولہ حواری فیمکث النبی بین اظھرھم ماشاء اللّٰہ یعمل فیھم بکتاب اللّٰہ و بامرہ حتیٰ اذا قبض اللّٰہ نبیّہٗ مکث الحواریون یعملون بکتاب اللّٰہ وبامرہ وبسنۃ نبیھم فاذا انقرضوا کان من بعدھم قوم

یرکبون رؤس المنابر یقولون ما یعرفون و یعلمون ما ینکرون فاذا رأیتم ذالك فحق علی کل مومن جهادهم بیده فان لم یستطع فبلسانه وان لم یستطع بقلبه ولیس وراء ذالك اسلام۔ (احیاء العلوم: ج ۲، ص ۳۶۱)

''حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی بدوں (بغیر) اس کے نہیں بھیجا کہ اس کے ساتھ کچھ مخلصین احباب ہوں، پھر جب تک اللہ چاہتا ہے نبی ان میں باقی رہ کر کتاب اللہ اور اس کے امر پر عمل کرتے ہیں، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو اٹھا لیتے ہیں اور اصحاب باقی رہتے ہیں، جو کتاب اللہ اور اس کے امر اور اپنے نبی کی سنت پر عمل کرتے ہیں، پھر جب وہ بھی ختم ہو جاتے ہیں ان کے بعد ایسی قوم آتی ہے جو منبروں پر سوار ہو کر (لوگوں سے) وہ کہتے ہیں جو معروف و مستحسن ہے اور خود منکرات پر عمل کرتے ہیں۔ پس جب تم (میری امت میں بھی) ایسا پاؤ تو ہر مومن پر ان کو ہاتھ سے روک دینا واجب ہے۔ اگر یہ نہ کر سکے تو زبان سے (روک دے)، اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو پھر دل سے (یعنی دل سے برا جانے)، اس کے بعد پھر کوئی اسلام کا درجہ نہیں۔''

ایک جماعت کی ضرورت:

الغرض کسی دین یا شریعت کی اشاعت اور اس کی بقا و استحکام اس کے بغیر ممکن نہیں کہ اس میں ایک جماعت اپنے رسل و انبیا کے حقیقی جانشین اور ان کے کام کو سرگرمی سے انجام دینے والے باقی رہے۔ اس لیے کرۂ ارض پر آج تک جتنے ادیان و ملل اور

جتنے شرائع و مذاہب اقوام عالم کے لیے دستور العمل بنا کر بھیجے گئے ان سب کی بقا کا مدار و مناط (مرکز و مقصد) یہی جماعت رہی۔ جب تک یہ جماعت استقلال و استقامت کے ساتھ اپنے کام کو انجام دیتی رہی، مذہب کا ستارہ اوج (بلندی) پر رہا، دین کی بنیادیں مستحکم ہوتی گئیں، اور جب اِس جماعت میں کمی آئی یا اس کے بعض افراد نے دین میں سستی اور مداہنت برتنی شروع کی تو مذہب کی بنیادیں متزلزل ہونی شروع ہوگئیں۔ آخر رفتہ رفتہ یہ قصر عالی الحاد و زندقہ کے طوفان نما سیلاب کی نذر ہوگیا۔ ملل سابقہ کی گم نامی اور کس مپرسی ان کی آسمانی کتابوں کا مسخ و محرف ہو کر ایک من مانی خواہشات کا مجموعہ بن جانا بہ زبان حال اِس مضمون کی تقریر کرتا ہے، اور حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک روایت نے اس کو صراحتاً بیان کر دیا ہے:

قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم لما وقعت بنو اسرائيل فى المعاصى نهتهم علمائهم فلم ينتهوا فجالسوهم فى مجالسهم و واكلوهم وشاربو هم فضرب اللّٰه قلوب بعضهم ببعض فلعنهم على لسان داؤد و عيسى ابن مريم ذالك بما عصوا و كانوا يعتدو ن. (مشکوٰۃ)

"حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کہ بنی اسرائیل (اولاد حضرت یعقوب علیہ السلام) گناہوں میں واقع ہوئی، ان کے علما نے ان کو منع کیا، وہ باز نہ آئے، پھر ان کے ساتھ ان کی مجالس میں مجالست شروع کر دی۔ اُن کے ساتھ کھاتے پیتے رہے، تو اللہ تعالیٰ نے آپس میں اُن کے دل ملا دیے، پھر بہ

ذریعہ داود علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اُن پر لعنت بھیجی۔ یہ اُن کے عصیان (گناہ) اور اعتدا (ظلم) کی وجہ سے ہوا۔"

الحاصل! چوں کہ ان کے علما و احبا نے دین میں مداہنت کی اور عصاۃ و نافرمانوں کے ساتھ شریک رہے، خود بھی ہلاک ہوے اور اپنی قوم کو بھی ہلاک کیا۔ وَذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ

قلمِ تقدیر ازل میں ان کے حق میں فیصلہ کر چکا تھا کہ یہ مذاہب قیامت تک باقی نہ رہیں گے۔ اسی کے مناسب اسباب پیدا ہوتے گئے۔ ان کے علما و احبا میں کچھ تو کمی آئی اور باقیین نے مداہنت فی الدین اور سستی اختیار کی۔ ہر مذہب و شریعت اپنی اپنی اجل مقدرہ کو پورا کر کے نیست و نابود ہو گئے۔ اس کے آثار تک مُــنْــدَرِس (مٹے ہوے) ہو گئے۔

هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا

(سورۂ مریم: ۹۸)

"کیا تم ان میں سے کسی کو محسوس کرتے ہو یا کسی کی پست آواز سنتے ہو؟ (نہیں)۔"

حضور علیہ السلام کو شرف عطا ہوا:

قیامت تک نہ مٹنے والا نوشتۂ تقدیر آگے آیا:۔

زمیں بدلے زماں بدلے زمانے کی ہوا بدلے
خدا! سب کچھ بدل جاے نہ قسمت کا لکھا بدلے

اور چوں کہ خیر الامم امت سید الرسل نبینا الاکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ شرف عطا کیا گیا تھا کہ قیامت تک نہ کوئی دین اس کو منسوخ کرے گا اور نہ مثل ملل ماضیہ کے یہ

معدوم ہوگی۔ اس لیے اس اُمت پر نبی وسید الرسل مقرر کیے گئے، جو مثل اور جملہ اوصاف حمیدہ کے امر بالمعروف میں بھی تمام انبیاے سابقین پر ایک خاص تفوق رکھتے تھے، بلکہ نظر دقیق حاکم ہے کہ اس افضل لرسل کی سیادت اور تفوق کی اصلی علت اور حقیقی منشا یہی ہے، کیوں کہ جس طرح کہ تمام انبیاے الوالعزم کو من جانب اللہ ایک ایک خاص انعامی خصوصیت عطا کی گئی ہے، جس میں وہ اپنے اشباہ وامثال میں ممتاز ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو حسن حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بلا واسطہ کلامِ الٰہی کا سننا، حضرت سلیمان علیہ السلام کو ہوا وغیرہ کا مسخر ہونا، حضرت داؤد علیہ السلام کو خوش آوازی، اسی طرح آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو:

اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (سورۂ قلم: ۴)

''البتہ آپ خلق عظیم پر ہیں۔''

کا خاص خلعت عطا فرمایا گیا تھا، اور یہ وہ ایک خصوصی فضیلت ہے جو نبوت کے مقصد اور بعثت کی غایت (اشاعت اسلام اور امر بالمعروف) سے ایک خاص تعلق رکھتی ہے۔

امر بالمعروف کا رکنِ اعظم:

چناں چہ اسلافِ امہ کے کارنامے اس پر شاہد ہیں کہ اسلام کی اس درجے اشاعت اور اس کا نورِ آفتاب کی طرح مشرق سے مغرب تک اقطارِ عالم میں اس طرح پھیل جانا کہ صفحۂ زمین پر اب تک کوئی دین اس طرح نہ پھیلا تھا۔ کیوں کہ انہوں نے تبلیغ احکامِ خداوندی اور امر بالمعروف کا بڑا آلہ حسن خلق کو بنایا تھا، اور اشاعت اسلام کے ساتھ دل داری اور حسن خلق کو بھی ہاتھ سے جانے نہ دیا تھا، تو در حقیقت حسن خلق ہی امر بالمعروف کا رکن اعظم ہے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

واما حسن الخلق فليتمكن به من اللطف والرفق وهو اصل الباب و اساسه والعلم والورع لا يكفيان فان الغضب اذا هاج لم يكف مجرد العلم والورع فی قمعه مالم يكن فی الطبع قبوله بحسن الخلق وعلی التحقيق فلا يتم الورع الامع حسن الخلق. (احیاء العلوم: ج۲، ص۲۹۴)

''بہرحال! حسنِ خلق (ملاطفت اور نرمی) سو اس کو تو مضبوطی کے ساتھ پکڑنا چاہیے۔ امر بالمعروف میں اصل اور اساس یہی ہے، اور علم وتقویٰ فقط کافی نہیں، کیوں کہ غصہ جب بڑھ جاتا ہے تو محض علم وتقویٰ اس کے بجھانے میں کافی نہیں ہوتا، جب تک طبیعت میں حسنِ خلق کے ذریعے سے صلاحیت قبول پیدا نہ کی جائے، اور حق تو یہ ہے کہ تقویٰ بدوں (بغیر) حسنِ خلق کے تمام ہی نہیں ہوتا۔''

نبی کے لیے انسان ہونا لازمی ہے:

حقیقت یہ ہے کہ کسی کو امر بالمعروف کرنا اور راہِ ہدایت پر لانا اس کے بغیر ممکن نہیں کہ لوگ اس سے مانوس ہوں، اس کی بات سنیں، اور یہی وجہ ہے کہ انبیا علیہم السلام ہمیشہ نوعِ انسان میں سے ہوتے رہے۔ کسی فرشتے کو نبی بنا کر مبعوث نہیں کیا گیا، کیوں کہ اس غیر جنس سے کسی انسان کا مانوس ہونا دشوار تھا۔ اسی لیے جب کہ کفار نے اعتراضا:

لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَیْهِ مَلَكٌ (سورۂ انعام:۸)

''کیوں نہ اتارا گیا ان پر فرشتہ؟''

پیش کیا تو جواب میں:

وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ

(سورۂ انعام: ۸،۹)

''اور اگر ہم کسی فرشتے کو نازل کرتے (اور تم پھر بھی نہ مانتے) تو عذاب کا حکم جاری کر دیا جاتا، پھر تمہیں مہلت نہ دی جاتی، اور اگر ہم نبی فرشتے کو بناتے تو اس کو بھی انسان بنا کر بھیجتے اور اس کو وہی لباس پہناتے جو تمام انسان پہنتے ہیں (تا کہ تم اس سے مانوس ہو کر فیض حاصل کرو)۔''

ارشاد ہوا۔

الغرض چوں کہ امر بالمعروف جو بعثت کا مقصد اور غایت ہے، چوں کہ لوگوں کے اُنس پر موقوف ہے اور انس بدوں (بلا) حسن خلق ممکن نہیں۔ چناں چہ قرآن مجید ناطق ہے:

وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَا نْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ

(سورۂ آل عمران: ۱۵۹)

''اور اگر تم بد خلق سخت دل ہوتے تو لوگ تمہارے اردگرد سے بھی بھاگ جاتے۔''

اس لیے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حسن خلق خصوصی رکھی گئی، تا کہ اس کے ذریعے سے امر بالمعروف میں بہ حسن اسلوب کامیابی حاصل کریں، اور یہی وجہ آپ کے تفوق اور فضیلت کی بن گئی، اور قرآن مجید میں ہے:

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ

(سورۂ حم السجدہ: ۳۳)

''اُس شخص سے زیادہ اچھا کہنے والا کون ہوگا جس نے لوگوں کو اللہ کی

طرف بلایا اور خود بھی صالح عمل کیے اور کہا کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں۔"

جس سے بہ تصریح معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے احسن وافضل ہونے کی اصلی علت اور بڑی وجہ آپ کا دعوتِ اسلام اور امر بالمعروف میں سب سے فایق اور افضل ہونا ہے۔

اُمت محمدیہ کا طغرائے امتیاز:

اسی طرح امت مرحومہ محمدیہ علیہ صاحبہا الف الف صلوٰۃ کا امم سابقہ سے طغرائے امتیاز یہی امر بالمعروف ہے۔ اسی پر ان کو امم ماضیہ پر فضیلت دی۔ اسی نے ان کو بارگاہ صمدی سے خیر اُمت کا معزز خطاب دلایا۔ قال تبارک و تعالیٰ:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (سورۂ آل عمران:۱۱۰)

"تم سب اُمتوں میں بہتر ہو، لوگوں کی ہدایت کے لیے پیدا کیے گئے ہو کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہو۔"

الغرض نبینا الاکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

علمت علم الاولین والآخرین.

"مجھے اگلوں اور پچھلوں کا علم دیا گیا ہے۔"

کے مصداق چوں کہ شرائع سابقہ کی تباہی و بربادی کے اسباب سے واقف تھا، اس لیے اپنی امت کو:

السعید من وعظ بغیرہ

''نیک بخت وہی ہے جو غیر کو دیکھ کر نصیحت پکڑے۔''

کی تعلیم دے کر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تاکید فرمائی، اور خود بھی اس کو نہایت مضبوطی اور غایت حکمت اور دانائی کے ساتھ پکڑا، اور اس کے لیے وہ اسلوب حسن اختیار کیا کہ جس نے بڑے بڑے سرکشوں کو رام کر دیا اور ہزاروں گردن کشوں کی گردنیں نیوڑھا (جھکا) دیں۔ کبھی ڈرا کر اور دھمکا کر اُمت کو راہِ ہدایت پر لانے کی کوشش کی اور کبھی نعیم اُخروی کی طمع دلا کر، اور کبھی واضح دلایل وشواہد اور قاطع حجج و براہین کے زور میں دبا کر۔ کہیں خلق و ملاطفت سے کام لیا اور کہیں سختی اور تشدد سے۔ کہیں باطنی اثر سے قلوب کو گرویدہ اور مسخر کیا اور کہیں ان اخلاق حسنہ کی پرزور تاثیر سے جن پر:

اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (سورۃ القلم:۴)

''البتہ آپ خلق عظیم پر ہیں۔''

کی مہر ہو چکی تھی، لوگوں کو والا وشیدا بنایا۔ بالجملہ طبایع عالم کے اختلاف اور زمانے کے انقلاب پر نظر رکھتے ہوئے اُس حکیم اُمت نے جس وقت جو طرز مؤثر سمجھا اس کو اختیار کیا۔

پہلا باب

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم

اور

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے اثرات

آپ کے اس حسن تدبیر اور حذر وتانی کا وہ روشن نتیجہ جس کو عالم نے بالعیاں دیکھا اور آج تک دیکھ رہا ہے، آپ کے امر بالمعروف میں افضل الرسل ہونے کی مجسم دلیل ہے۔

اخلاق ذمیمہ اخلاق حسنہ سے بدل گئے:

عرب کی وہ جاہل اکھڑ غلیظ الطبع ہٹ دھرم قسی القلب قوم جن کو جہالت گھٹی میں پلائی گئی اور جو کفر وضلالت کا دودھ پی پی کر جوان ہوئے، جن کی صدہا پشت تک علم کا نام ونشان نہ تھا، جن پر اس وقت تک کوئی حکومت تسلط قایم نہ کرسکی تھی، جن کے نزدیک اخلاق ذمیمہ اسی طرح قابل فخر تھے جس طرح کسی شریف الطبع انسان کے نزدیک اخلاق حسنہ۔ نہ صرف خود ہی مہذب اور با اخلاق متمدن علمی اور عملی کمالات کی جامع ہوگئی، بلکہ تہذیب اور تمدن علم وعمل، اخلاق وعادات میں دنیا کی استاد تسلیم کی گئی۔

عرب کے متکبر سردار:

قریش کے مغرور بنی مخزوم و بنی امیہ اور عرب کے متکبر بنو جعفر ابن کلاب اور بنو زرارۃ ابن عدی، جن کے دماغوں میں عجب و تکبر گھر چکا تھا، جن کی خود بینی اور خود پسندی اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ سعید ابن زراہ (زمانۂ جاہلیت کا ایک سردار ہے) سے ایک عورت آ کر کہتی ہے کہ اے اللہ کے بندے! فلاں مکان کا راستہ کس طرف کو ہے؟ تو سعید ابن زراہ کو طیش آ جاتا ہے اور عورت کو بہت بُرا بھلا کہنے کے بعد کہتا ہے کہ کم بخت! مجھ جیسا بڑا سردار اللہ کا بندہ ہو سکتا ہے؟ نعوذ باللہ من الشیطن همزه ونفخه و نفثه۔ (مستطرف ج ۲ ص ۸)

اسی طرح عبداللہ ابن زیاد تمیمی نے ایک مرتبہ بصرہ میں ایک جامع بلیغ اور مختصر خطبہ پڑھا، لوگوں کو اس کا خطبہ پسند آیا اور اطراف مجلس سے کثر اللہ فینا مثلك کی صدائیں بلند ہونی شروع ہوئیں، یعنی اللہ تعالیٰ ہماری قوم میں تجھ جیسے بلیغ و فصیح زیادہ پیدا کرے، تو عبداللہ ابن زیاد جس کی آنکھوں کو خود پسندی کے غبار نے اندھا کر دیا تھا، بول اٹھا:

لقد کلّفتم اللّٰه شططاً۔ (نعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم و نلوذ الیہ)

''تم نے اللہ تعالیٰ کو اس کی قدرت سے زیادہ تکلیف دی۔''

عادت کا چھوڑنا دودھ چھوڑنے سے زیادہ سخت ہے:

پھر وہ کون سی جادو بھری دل کش اور مؤثر تقریر تھی جس کے سنتے ہی رنگ بدلنا شروع ہوا۔ ان متکبر قبایل میں ہل چل مچ گئی؟ کان میں پہنچتے ہی متکبر دماغوں کا تنقیہ (پاک) ہونا شروع ہو گیا؟ قرنوں اور برسوں کی راسخ شدہ عادت کچھ دنوں میں

بدل گئی؟ حال آں کہ ایک ادنا سی عادت کا چھوڑنا بھی نفس پر بہت شاق گزرتا ہے۔

امام شعرانیؒ لطائف المنن والاخلاق میں فرماتے ہیں:

قال العارفون باللّٰہ فطام العادۃ اصعب من فطام الرضاعۃ

''عارفین نے کہا کہ عادت کا چھوڑنا دودھ چھوڑنے سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔''

ایک ہی نظر میں فیصلہ ہوگیا، جس پر نظر پڑی یہ کہے بغیر نہ رہا:

مستانہ فگندی بمن از نازنگا ہے
قربان نگاہ تو شوم بازنگا ہے

خود پسندی والے تواضع والے بن گئے:

آخر ایک دن آیا کہ اسی متکبر خود پرست قوم کی شان:

اَلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ فِي الْاَرْضِ عُلُوًّا وَّلَا فَسَادًا

(سورۂ قصص:۸۳)

''وہ لوگ جو زمین میں تکبر اور فساد کا قصد نہیں کرتے۔''

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا

(سورۂ فرقان:۶۳)

''اللہ تعالیٰ کے ایسے بندے کہ زمین پر تواضع سے آہستہ چلتے ہیں۔''

وہی دماغ جو عجب وخود پسندی کا ظلمت کدہ بنے ہوئے تھے اب تواضع اور کفرنفسی کے نور سے معمور ہوگئے۔ انہیں میں وہ:

سلاطین بالنہار ورھبان باللیل

''دن میں بادشاہ رات کو (اللہ کے سامنے) فقیر زاہد۔''

پیدا ہوئے، جو باوجود امیر المؤمنین وخلیفۃ المسلمین ہونے اور مملکت دنیا پر حکم راں ہونے کے افراد امت میں سے کسی ایک ادنا آدمی سے بھی اپنا تفوق جایز نہ رکھتے تھے۔ابوبکر وعمر انہیں میں پیدا ہوئے،عثمان وعلی انہیں میں سے نکلے۔رضی اللہ عنہم!

اپنے نفس کا علاج:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ ایک نیا کُرتا پہن کر تشریف لائے اور پھر خود ہی اس کی ایک آستین قطع کردی۔لوگوں نے دریافت کیا تو فرمایا کہ یہ کُرتا پہن کر میں اپنے نفس کو اچھا معلوم ہوا، میں نے اس کو بدنما کر کے نفس کا علاج کیا ہے۔ سبحان اللہ! نہ یہ کوئی تکبر تھا اور نہ ناجایز خود پسندی۔کیوں کہ ایک مرتبہ یہ مسئلہ خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا گیا کہ اچھا کپڑا پہننا اور خوش نما لباس رکھنا عجب میں تو داخل نہیں؟ آپ نے جواب میں فرمایا کہ اچھا کپڑا اور ستھرا لباس تو عند اللہ محبوب ہے۔

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

عن النبي صلي الله عليه وسلم قال لا يدخل الجنة من كان في قلبه مثقال ذرة من كبر قال رجل ان الرجل يحب ان يكون ثوابه حسنا و نعله حسنة قال ان الله جميل و يحب الجمال. (مسلم:ج۱،ص۶۵)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ وہ شخص جنت میں داخل نہ ہوگا جس کے قلب میں ایک ذرّے کی برابر بھی کبر ہوگا۔ایک شخص نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! ہر آدمی پسند کرتا ہے کہ اس کا کپڑا اچھا ہو، اس کا جوتا

اچھا ہو (یہ تو کہیں کبر نہیں؟) فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جمیل ہے اور جمال کو محبوب رکھتا ہے (یہ کبر نہیں)۔"

مگر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی محتاط طبیعت نے اس کو بھی گوارا نہ فرمایا تا کہ کہیں رفتہ رفتہ یہ عجب و تکبر تک نہ پہنچ جاے۔

میں اپنے نفس کا علاج کرتا ہوں:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی عظمت وجلال سطوت وسلطنت سے کون سا وحشی واقف نہیں، مگر بہ ایں ہمہ تواضع کی یہ حالت ہوئی کہ ایک مرتبہ بعض قبایل عرب کے وفود آپ کی خدمت میں حاضر ہوے، جب امیر المؤمنین ان کے کام سے فارغ ہوے تو مشکیزہ مونڈھے پر رکھا اور بہ نفس نفیس اس میں پانی بھر کر ایک بڑھیا کے گھر لے گئے۔ لوگ دیکھ کر دوڑے اور عرض کیا کہ اے امیر المؤمنین! ہمارے ماں اور باپ آپ پر قربان ہوں، ہم اتنے خادم موجود ہیں، آپ نے کیوں اتنی تکلیف اُٹھائی؟ فرمایا کہ میں اپنے نفس کا علاج کرتا ہوں۔ مجھے خوف ہے کہ عرب کے وفود کے آنے سے میرے قلب میں تکبر پیدا نہ ہو جاے۔

کوئی بتلاے تو سہی کہ ان کے مزاجوں میں یہ انقلاب عظیم کس نے پیدا کیا تھا؟ کہاں وہ غرور و خود پسندی اور کہاں یہ تواضع اور مسکنت؟

به بین تفاوت ره از کجاست تا به کجا

یہ اگر آپ کے حسن امر بالمعروف کا بین اثر نہیں ہے تو کیا ہے؟

وہ جہلا عجایب پرست ہر نئی چیز کے سامنے سر جھکا دینے والے خود تراشیدہ چند پتھر کے ٹکڑوں کو رازق و مالک علام وخبیر جاننے والے ایسے موحد مشدد فی التوحید بن گئے

کہ انہیں توحید اپنی جان سے زیادہ عزیز ہوگئی۔ ان کو آگ میں جل کر خاک سیاہ ہو جانا، دریا میں غرق ہو جانا، تلوار سے سر قلم ہو جانا، اس سے زیادہ آسان ہوگیا کہ کلمۂ شرک اپنی زبان پر لائیں۔ شرک کے شبہے اور واہمہ سے دور بھاگنے لگے۔

میں تیری حقیقت خوب جانتا ہوں:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ وارضاہ حج کے لیے تشریف لائے اور حجر اسود کو بوسہ دیتے ہوئے فرمایا کہ میں خوب جانتا ہوں کہ تیری حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ تو ایک پتھر کا ٹکڑا ہے۔ میں تجھے نہ حاکم سمجھتا ہوں اور نہ مالک، نہ رازق جانتا ہوں اور نہ خالق، مگر صرف اس وجہ سے تجھ کو بوسہ دیتا ہوں کہ میں نے اپنی آنکھوں سے رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو بوسہ دیتے ہوئے دیکھا ہے۔ مجمع عام میں یہ فرما کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو بتلا دیا کہ پتھر کوئی چیز نہیں، تاکہ آیندہ لوگ اس کی پرستش نہ کرنے لگیں اور شرائع سابقہ کی طرح اس شریعت میں بھی بت پرستی نہ ہونے لگے۔

درخت کی تعظیم برداشت نہ ہوئی:

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ''شجرۃ الرضوان'' کو جس کے نیچے بیٹھ کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے بیعت لی تھی، اس لیے آروں اور کلہاڑوں کی نذر کر دیا کہ لوگ اس کی زیارت کا قصد کر کے وہاں جاتے تھے۔ حال آں کہ ان کا یہ فعل اس وقت اس حد تک کوئی کراہت کا پہلو لیے ہوئے نہ تھا بلکہ ایک درجے میں مستحب تھا، کیوں کہ درحقیقت یہ اس درخت کی محبت نہ تھی بلکہ اس محبوب العالمین کی چاہ تھی جو ان کو اس کی طرف کھینچتی تھی:

ومن دید فی حب الدیار لاھلھا
وللناس فیما یعشقوق مذاھب
امر علی الدیار دیارِ لیلیٰ
اقبل ذالجدار و ذالجدار

''میری عادات میں سے بہ وجہ صاحب خانہ کے اس کے گھر کی محبت کرنا ہے، اور عشق کرنے کی چیزوں میں لوگوں کے مختلف طریقے ہیں۔ میں بعضے دیار (لیلیٰ کے گھر پر) گزرتا ہوں تو کبھی اس دیوار کو چومتا ہوں اور کبھی اس دیوار کو۔''

مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دوربین اور مآل اندیش طبیعت نے اس کو بھی بہ ایں خیال جائز نہ رکھا کہ اگر اِس درخت کی تعظیم اسی طرح بڑھتی رہی تو کہیں آیندہ مستحب باعث اس کی پرستش اور افشائے شرک کا باعث نہ ہو جائے۔ یہ تھا اس نبی امی علیہ الف الف صلوٰۃ کی پاکیزہ تعلیم اور حسن امر بالمعروف کا بین معجزہ۔

بچی کو زندہ در گور کرنے والے بچی کی تربیت پر جھگڑا کرنے لگے:

وہ بے رحم اور ظالم قوم کہ لوٹ مار، قتل وقتال، فتنہ وفساد جن کا پیشہ تھا، کسی کی آبروریزی، مارپیٹ کر لوٹ لینا ان کے نزدیک ایک ادنا بات تھی، جن کی بے رحمی اور سخت دلی یہاں تک بڑھ گئی تھی کہ اپنی اولاد کو جیتے جی نیچے اتار کر منوں مٹی کے تودے میں داب دینا اُن کے پتھر دلوں میں کوئی حرکت پیدا نہ کرتا تھا۔ ان کی اولاد کا یا ابتا (اے میرے باپ) یا اماہ (اے میری ماں) کہتے رہ جانا ان کے دلوں کو نہ ہلاتا تھا۔

آپ کی تعلیم اور امر بالمعروف کی دل گیر تاثیر سے اب ان کی یہ حالت ہوگئی کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ عم نبی علیہ السلام کی چھوٹی بیٹی کی تربیت میں صحابہ میں جھگڑا ہوتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کی تربیت میں کروں گا، میں زیادہ حق دار ہوں، کیوں کہ یہ میری چچا کی بیٹی ہے، اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ میں احق بالتربیت ہوں، کیوں کہ یہ میری چچا زاد بہن بھی ہے اور اس کی خالہ بھی میرے گھر میں ہے، اور حضرت زید رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ اس کی تربیت کا زیادہ مستحق میں ہوں کہ یہ میری بھتیجی ہے۔ آخر جھگڑا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں پہنچا، آپ نے اس کی خالہ کو احق بالتربیت قرار دے کر حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے حق میں فیصلہ کر دیا، اور فرمایا:

الخالة بمنزله الأمّ

''خالہ بہ منزلہ ماں کے ہوتی ہے۔''

بے شرمی کی جگہ باحیا:

وہ بے حیا و بے شرم لوگ جن کے یہاں زنا کاری اور بدکاری شایع اور عام تھی، جن کے یہاں فخراً کہا جاتا تھا کہ میں نے فلاں سردار کی لڑکی سے زنا کیا۔ جن کے یہاں غیروں کی ازواج پر قصیدے لکھنا اور اُن کی بے آبروئی کرنا ایک ادنا کام تھا۔ امراء القیس (جاہلیت کا ایک شاعر) ایک عورت کو خطاب کر کے فخراً کہتا ہے:

فمثلك حبلى قد طرقتُ ومرضع

فالهيتها عن ذى تمائم محول

اذا ما بكا من خلفها انصرفت له

بشق وتحتی شقها لم تحول

''پس تجھ جیسی حاملہ اور دودھ پلانے والی عورتوں کے پاس میں رات کو گیا
تو ان کو اُن کے ایک سال کے چھوٹے بچوں سے بے پرواہ کر دیا۔ جب
بچہ اُس کے پیچھے روتا تھا تو پھر کر اُس کو دیکھتی تھی، مگر اُس کی ایک کروٹ
میرے نیچے رہتی تھی جو بدلتی نہ تھی۔''

اور اب وہی قوم تھی اور اُسی جماعت کے افراد تھے کہ بہ سرکردگی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بیت المقدس فتح کرنے کے لیے گئے۔ وہاں کے علما واحبا نے جو اگر چہ خود تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر نورِ الٰہی اور حقیت کے آثار نمایاں دیکھ کر اُن کے مطیع ہو چکے تھے مگر قوم کو ان کا امتحان کرانے کے لیے حکم دیا کہ اچھا فیصلہ اس پر ٹھہرا کہ تم ایک بازار کو نہایت آراستہ وپیراستہ کر کے اس میں ہر قسم کی اشیا مہیا کر دو اور ہر ایک دکان پر ایک ایک خوب صورت حسینہ جمیلہ عورت کو اپنے شہر میں سے انتخاب کر کے بٹھلا دو، اور اس بازار کو بالکل خالی کر دو اور عورتوں کو حکم کر دو کہ وہ جس چیز کی خواہش کریں ان کو بلا قیمت بے تامل دے دیں، اور بے حجابانہ ملاطفت وناز وانداز سے پیش آئیں اور ان کو اپنی طرف مایل کریں، اور پھر مسلمانوں کی فوجوں کو اس بازار سے گزارو، اگر ان کا کوئی سپاہی کسی عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے تو بے شک تم اپنے گھر بیت المقدس کو ان سے خالی کر دو اور ان کے قتال میں اپنی متفقہ قوت سے کام لو، ورنہ پھر ایسی بے لوث حق پرست جماعت سے لڑنا پہاڑ میں ٹکر مارنا ہے۔ چناں چہ سب نے اس مشورے کو قبول کیا۔ مسلمانوں کی فوجیں اس بازار سے نکلیں مگر وہ خدا کے خایف بندے:

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ

ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ (سورۂ نور:۳۰)

''اور مؤمنین سے کہہ دیجیے کہ اپنی نگاہیں پست رکھیں، یہی ان کے لیے
باعث تزکیہ وتطہیر ہے۔''

کا خطاب سن چکے تھے۔ کسی فرد نے آنکھ اٹھا کر یہ بھی نہ دیکھا کہ یہاں کیا رکھا ہے؟
آخر سب نے متفق ہو کر بیت المقدس بلا جدال وقتال مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔

دوسرا باب

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی ترغیب اور چھوڑنے پر ترہیب

آپ کے امر بالمعروف اور حسن تعلیم کے عجیب وغریب کرشمے اور عمدہ نتائج کا احصا (شمار) نہ کسی بشر کی طاقت میں ہے اور نہ یہاں مقصود۔ محض تمثیلاً دو چار واقعات بہ طور نمونہ پیش کرنا مقصود تھا، اور حقیقت یہ ہے کہ صحابہؓ کا ہر فرد اعلیٰ سے لے کر ادنا تک آپ کے امر بالمعروف میں حسن اسلوب اور خوبیٔ تعلیم کی زندہ دلیل تھا۔

کسی غیر مشہور ادنا سے صحابی کے حالات اٹھا کر دیکھیے اور ان کی قبل اسلام کی حالت سے موازنہ کیجیے، تو کالشمس فی رابعة النهار ظاہر ہو جائے گا کہ جو طریق، جو اسلوب تبلیغ احکام خداوندی اور امر بالمعروف میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا تھا اس وقت تک کسی نبیٔ مبعوث کو نہ ملا تھا۔

الحاصل چوں کہ تجربے نے یہ امر بالکل صاف اور منقح (سچ) کر دکھایا تھا کہ کسی مذہب وملت کی اشاعت وکثرت اور اُس کی بقا اس کے بغیر ناممکن ہے کہ اس میں ایک جماعت اپنے انبیا کی قایم مقام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتی رہے۔ اس لیے

حکیم امت مبینا الاکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رکن اعظم کا نہایت اہتمام واعتنا کیا اور آپ کی امت مرحومہ کو اس میں ایک خاص حصہ دیا گیا۔ اُن کی آسمانی کتاب (قرآن مجید) کے صفحات اس کی تاکید سے بھرے ہوئے ہیں اور حدیث کے اوراق اس کی ترغیب سے معمور نظر آتے ہیں۔ قال تعالیٰ:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

(سورۂ آل عمران:۱۰۴)

''اور بے شک تم میں ایک ایسی جماعت کا رہنا فرض ہے جو (لوگوں کو) ایمان کی طرف بلائیں اور اچھے کاموں کا امر اور بُرے کاموں سے منع کرتے رہیں، اور وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''

جس میں تمام امت کو خطاب عام فرما کر بیان فرمادیا کہ تم سب کے ذمے فرض ہے کہ اپنے اندر ایک ایسی جماعت قایم رکھو جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا کریں، ورنہ تم سب ترک فرض کے جرم میں ماخوذ ہو گے:

وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ ۝ (سورۂ ص:۸۸)

''اس کا مفصل بیان آپ تھوڑی دیر کے بعد معلوم کریں گے۔''

فلاح دارین والے لوگ:

اور پھر حصر کے ساتھ فرمادیا:

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (سورۂ بقرہ:۵)

کہ فلاح دارین پانے والے وہی لوگ ہیں جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

کرتے رہیں۔ ورنہ سمجھ لیں کہ جو امم سابقہ پر اُفتاد (مصیبت) پڑی کہ دنیا میں ذلیل و خوار ہو کر نیست و نابود ہو گئے اور آخرت میں عذاب الٰہی میں گرفتار ہو گئے، تمہارے سامنے بھی پیش آنے والی ہے، مگر یہ امت چوں کہ خداوند عالم کے خاص انعام واکرام میں رہی تھی اور حق جل وعلیٰ کی رحمت کے دروازے اُن کے لیے مفتوح (کھلے) رہے، اُس کی رحمت نے گوارا نہ کیا کہ یہ بھی امم ماضیہ کی طرح بے نشان ہو کر پردۂ نسیان میں چھپ جائیں۔ اس لیے اِس امت کے واسطے خود قیامت تک اس جماعت کی بقا کے حامی ہو گئے۔ اس کے حبیب سید الرسل صلی اللہ علیہ وسلم خبر دیتے ہیں:

لا تزال طائفة من امتی منصورین لایضر هم من خذ لهم حتی تقوم الساعة.

''میری امت میں ہمیشہ ایک ایسی فتح مند جماعت باقی رہے گی کہ ان کو ان کے مقابلہ کرنے والے نصرت نہ پہنچا سکیں گے، جب تک کہ قیامت قایم ہو۔''

اور بعض روایات میں اسی جماعت کے متعلق:

تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (سورۂ آل عمران:۱۱۰)

''حکم کرتے ہو اچھے کاموں کا اور منع کرتے ہو برے کاموں سے۔''

کی تصریح ہے۔

بالجملہ چوں کہ عند اللہ اور عند الرسول یہ امر نہایت مہتم بالشان تھا، اس لیے کہیں درجات اخروی اور فلاح دارین کی طمع دلا کر امت مرحومہ کو اس کی تاکید فرمائی اور حصر کر کے فرمادیا: وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔

علامہ نظام الدین ابن حسین القمی النیسا پوریؒ اپنی تفسیر میں اس آیت کے تحت میں فرماتے ہیں:

وکفی بقولہ تعالیٰ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ. ای الاختصاص بالفلاح بحالهم.

(تفسیر نیسا پوری برحاشیہ تفسیر ابن جریر مصری: ج۴، ص۳۲)

''اس جماعت کی فضیلت کے لیے اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ کافی ہے۔''

کیوں کہ اس میں فلاح دارین کو اسی جماعت کے ساتھ مخصوص کردیا ہے، اور فلاح دارین کے بعد انسان کو کس چیز کی ضرورت ہے؟

اور اسی تفسیر اور نیز تفسیر روح البیان میں ہے:

وروی عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم من امر بالمعروف ونهی عن المنکر فهو خلیفة اللّٰہ فی ارضه وخلیفة رسول اللّٰہ وخلیفة کتابه. (ص:۳۵۴)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ جو شخص امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا ہے وہ زمین میں اللہ کا خلیفہ ہے اور اس کے رسول کا اور اس کی کتاب کا۔''

قاضی بیضاویؒ آیت مذکورہ کے تحت میں روایت کرتے ہیں:

انه علیه السلام سئل من خیر الناس فقال آمرهم بالمعروف وانهاهم عن المنکر واتقاهم للّٰہ واوصلهم

للرحم.

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ سب سے بہتر آدمی کون ہے؟ فرمایا: جو زیادہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والا ہو اور زیادہ متقی ہو اور زیادہ صلہ رحمی کرتا ہو۔''

اسی طرح کلام اللہ کے متعدد مواضع میں اپنے محبوب اور مخلص بندوں کی تعریف و ثنا میں خداوند عزوجل نے: تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ فرما کر اُمت کو ترغیب دلائی ہے کہ ہمارے نزدیک برگزیدہ اور مقبول ہونے کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب امر بالمعروف اور نہی عن ہے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر چھوڑنے پر ترہیب:

غرض کہیں تو اس طرح درجات اُخروی اور تقرب الی اللہ کی طمع دلا کر اُمت کو امر بالمعروف کی طرف بلایا اور کہیں ترہیب سے کام لیا۔ ان کو ترک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر ڈرایا اور دھمکایا۔ چناں چہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال والذی نفسی بیدہ لتامرن بالمعروف ولتنھون عن المنکر اولیوشکن اللہ ان یبعث علیکم عذاباً من عندہ ثم لَتَدْعُنَّہ فلا یستجاب لکم. (مشکوۃ)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضے میں میرا نفس ہے، البتہ یا تو تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو ورنہ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر کوئی اپنا عذاب بھیج دے، پھر تم

دعائیں کرتے رہ جاؤ اور تمہاری دعائیں قبول نہ کی جائیں۔"

اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ایک طویل حدیث میں ہے:

قال انی سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم یقول ان الناس اذا راؤا منکراً فلم یغیروه یوشك ان یعمهم اللّٰہ بعقابه.

"فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ فرماتے تھے کہ لوگ جب کسی منکر کو دیکھیں پھر اس کو بدل نہ دیں تو قریب ہے کہ اللہ ان پر بھی اپنے عذاب کو عام کردے۔"

چناں چہ امتوں کے سوانح اور ان کی ہلاکت کے وقایع ان پر شاہد ہیں، اور فی الحقیقت قاعدہ یہی ہے، جب آگ بھڑک اٹھتی ہے تو پھر تر و خشک کا امتیاز نہیں رہتا:

چواز قومے یکے بے دانشی کرد
نہ کہ را منزلت ماند نہ سہ را

اللہ کی طرف سے معروف کی حفاظت اور حمایت:

پھر چوں کہ خدائے جل وعلی خود اس امت کے لیے جماعت آمرینِ بالمعروف کی حفاظت اور بقا کا حامی بن گیا ہے، اس لیے ترک امر بالمعروف کی سزا کو صرف اُخروی باز پرس اور عذاب آخرت پر منحصر نہیں رکھا بلکہ فرمادیا:

عن جریر ابن عبداللّٰہ قال سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم یقول ما من رجل یکون فی قوم یعمل فیهم بالمعاصی یقدرون علی ان یغیروا علیه ولا یغیرون الا

اصابه الله منه بعقابة قبل ان یموتوا.

''حضرت جریر ابن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ایسا کوئی نہیں کہ وہ ایسی قوم میں ہو جن میں معاصی پر عمل کیا جاے اور وہ اس پر قادر ہوں کہ اسے بدل دیں اور پھر نہ بدلیں، بلا اس کے کہ اللہ تعالیٰ اُن کے مرنے سے پہلے اس پر عذاب نازل فرمادیں۔''

ورنہ جیسا کہ ابنائے زمانہ کی دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے والی کوتاہ نظریں تمام امور شرعیہ اور امورات الٰہیہ میں کوتاہی اور پہلو تہی کرتی اور تعیش دنیوی کے نشے میں عذاب آخرت کو بھی نظر میں نہیں لاتیں:۔

شب دل آرام سے گزرتی ہے
صبح کو جام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے
یہاں تو آرام سے گزرتی ہے

ممکن تھا کہ اسی طرح اس امر بالمعروف کے فریضے میں بھی مداہنت اور سستی کرتیں، یہاں تک کہ یہ شریعت بھی شرائع سابقہ کی طرح پامال الحادوزندقہ ہو جاے۔

نہی عن المنکر کا فریضہ چھوڑنے پر عذاب:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اوحی الله عزوجل الی جبرئیل علیه السلام ان اقلب مدینة کذا و کذا

بـاهلها فقال يارب ان فيهم عبدك فلا نالم يعصك طرفة عيـن فـقـال اقـلبها عليه و عليهم فان وجهه لم يتمعرفى ساعة قط.

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عزوجل نے جبرئیل علیہ السلام کو حکم کیا کہ فلاں شہر کو مع اُن کے مکان اُلٹ دیں۔ جبرئیل علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے میرے رب! ان میں تو ایک تیرا فلاں بندہ بھی ہے، جس نے ایک لحظہ بھی تیرا گناہ نہیں کیا۔ فرمایا: (کچھ پرواہ نہ کر) اس پر بھی اور جمیع (سارے) شہر والوں پر شہر کو اُلٹ دو۔ اس لیے کہ میرے معاملے میں کبھی اُس کا چہرہ ایک گھڑی کو متغیر بھی نہیں ہوا۔''

یعنی اِس شخص کی عبادت و بندگی کس کام کی جب کہ یہ ہمارے شرائع کو مٹتے ہوئے دیکھتا رہا اور اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی؟ اس نے ہماری آیات کے ساتھ تمسخر ہوتے ہوئے دیکھا اور اس کے دل پر سانپ نہ لوٹ گئے؟ اگر اس کم بخت کو اپنی جان ہی ہماری شرائع و آیات کے مقابلے میں زیادہ عزیز تھی تو دل میں غضب ناک ہونے اور چہرے پر غصے کے آثار نمایاں ہونے سے کون مانع ہوتا تھا؟

آپ اپنے احباب دنیا پر قیاس کر لیجیے کہ ایک شخص جو آپ کے ساتھ خلوص و محبت کا دعویٰ رکھتا ہو اور پھر اس کو آپ اپنے دشمنوں کی مجالس میں، جب کہ وہ آپ کا استہزا کر رہے ہوں، آپ کا مضحکہ اڑا رہے ہوں، شریک پائیں، اگر چہ یہ بھی دیکھ لیں کہ یہ بالکل ساکت ہے، اس کی زبان سے کوئی کلمۂ استہزا و مسخریہ کا آپ کی نسبت نہیں نکلا، مگر اب آپ اپنے دل کو ٹٹول کر فرمائیں کہ آپ کا اس دوست کی نسبت کیا خیال ہوگا؟ آپ کو اس پر غصہ آئے گا یا نہیں؟ اور اُس کو دشمنوں کے ساتھ شریک کار سمجھیں گے یا

نہیں؟ بے شک وہ شریکِ استہزا سمجھا جائے گا۔

حاضر غایب کے اور غایب حاضر کے حکم میں:

حدیث میں ہے:

عن العرس ابن عميرة عن النبی صلی الله عليه وسلم قال اذا عملت الخطيئة فی الارض من شهدها فكرهها كان كمن غاب عنها ومن غاب عنها فرضيها كان كمن شهدها.

''حضرت عرس ابن عمیرہؓ سے روایت ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، آپ نے فرمایا کہ جب زمین پر گناہ کیا جاتا ہے تو جو شخص اُس گناہ میں حاضر ہو کر اُس کو مکروہ سمجھتا رہے وہ حکماً مثل غایب کے ہے، اور جو غایب اس پر راضی ہو وہ حاضر کے حکم میں ہے۔''

ایسے وقت میں ایک مخلص دوست کا اصلی فریضہ تو یہ ہونا چاہیے کہ وہ اُن سے لڑنے مرنے کو تیار اور کمربستہ ہو جائے، اور اگر اُن کی کثرت کے مقابلے میں اس کی سعی کارگر نہ ہو سکے تو اپنی جان پر کھیل جائے: ؎

سودا قمارِ عشق میں خسرو سے کوہ کن
بازی اگرچہ لے نہ سکا سر تو کھو سکا

اور اگر اتنی ہمت و جرأت اپنے نفس میں نہ پائے تو زبان سے ہی منع کر دے، اور حتی الوسع ان کو اس استہزا کے ترک پر مجبور کرے، اور اگر ضعف ہمت یہاں تک رگ و پے میں اثر کر جائے کہ اس کی بھی طاقت اپنے نفس میں نہ پائے تو پھر اپنے نفس پر تو

اس کو اختیار ہے، اس مجلس سے تو اُٹھ کھڑا ہو، ورنہ پھر اس میں اور آپ کے دشمنوں میں کیا فرق ہے؟

وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ (سورۂ نساء: ۱۴۰)

''تحقیق تم پر قرآن میں نازل کیا گیا ہے کہ جب تم اللہ تعالیٰ کی آیات پر کفر و استہزا ہوتے ہوئے سنو تو ان کے ساتھ نہ بیٹھو، جب تک کہ وہ کوئی دوسری بات نہ شروع کریں۔ اس لیے کہ تم بھی اس وقت میں (جب کہ اُن کے ساتھ مجالست کرو) ان کی مثل سمجھے جاؤ گے۔''

تیسرا باب

امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور اسلاف کرام

اس لیے بزرگانِ دین نے اگر اعداء اللہ (اللہ کے دشمنوں) کی کثرت اور غلبہ دیکھ کر کسی وقت ان کے سامنے انکار کرنے اور کھلم کھلا مخالفت کرنے کو مصلحت نہ سمجھا تو ان کی مجالس میں شریک بھی نہ رہے، اور یہی وجہ تھی کہ جب سلاطین اسلام اور امرا میں دنیا کی طرف میلان اور آرام طلبی کا غلبہ ہونا شروع ہوا، ان کی مجالس میں منکرات کا شیوع ہوا، کسی کی پندو نصیحت ان کے قلوب پر اثر نہ کرتی تھی تو اکابر سلف نے ان کے سامنے اظہار مخالفت کو بہ خوف فتنہ وفساد مصلحت نہ سمجھ کر گوشہ نشینی اختیار کر کے زاویہ بیت کو:

السلامة فی الواحدة

"سلامتی تنہائی میں ہے۔"

کا منظر بنالیا تھا، اور بعض سلف نے اس شہر میں بھی رہنا پسند نہ کیا جس میں علی الاعلان (منکر) ہوتے ہوں، گھر بار کو خیر باد کہا۔ علایق وطن کو قطع کر کے نکل کھڑے ہوے اور غربت کے مشاق کے تحمل کو منکرات کے دیکھنے سے زیادہ آسان سمجھا:

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
تم رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

ابن قزوینیؒ کا بغداد چھوڑنے کا سبب:

شیخ احمد ابن اسمٰعیل قزوینی الطالقانیؒ کے حالات میں احمد ابن سکینہؒ جو شیخ موصوف کے ایک دوست ہیں، نقل فرماتے ہیں کہ جب بغداد میں ابن صاحب نے رفض و تشیع کی اشاعت شروع کی، روافض بغداد میں حشرات ارض کی طرح پھیل گئے۔ رفض وبائے عام بن کر اُڑ اُڑ کر لوگوں کو ہلاک کرنے لگا۔ شہر میں کھلم کھلا صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو گالیاں دی جانے لگیں، تو ایک رات شیخ احمد قزوینی طالقانیؒ میرے پاس آئے اور کہا کہ بھائی! آج ہم تم سے رخصت ہوتے ہیں، اب اس سے زیادہ بغداد میں ٹھہرنے کی ہمت نہیں۔ میں نے سبب پوچھا تو فرمایا:

معاذ اللہ ان اقیم ببلدۃ یجھر فیھا بسب اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم. (طبقات الشافعیۃ الکبریٰ)

"اللہ کی پناہ ایسے شہر میں ٹھہرنے سے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو علانیہ گالیاں دی جاتی ہوں۔"

اور اسی وقت چل دیئے:

نہ سدھ بدھ کی لی اور نہ منگل کی لی
نکل شہر سے راہ جنگل کی لی

شیخ قزوینیؒ کی وفات کا عجیب واقعہ:

شیخ احمد قزوینیؒ کے اتباع سنت اور زہد و عبادت کے حالات یوں تو بہ کثرت مشہور

ومعروف ہیں، مگر اُن کی وفات کا عجیب واقعہ ہے، جس کو امام رافعیؒ نقل فرماتے ہیں، نہایت حیرت انگیز ہے۔

فرماتے ہیں کہ شیخ موصوف ہفتے میں تین بار وعظ فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ آیت کریمہ:

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِیَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (سورۂ توبہ:۱۲۹)

''اگر وہ اعراض کریں تو کہہ دیں کہ مجھے اللہ تعالیٰ کافی ہیں، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔''

پر وعظ فرما رہے تھے۔ اثنائے وعظ میں فرمایا کہ اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہفتے سے زیادہ اس عالم میں زندہ نہیں رہے۔ اس کے بعد طالقانی جب وعظ ختم کر کے منبر سے اُترے، فوراً بخار نے گھیر لیا اور سات ہی روز بیمار رہ کر دارِ فانی سے رحلت فرما گئے۔

امام رافعیؒ کہتے ہیں کہ جس روز ان کا انتقال ہوا میں صبح ہی ان کی تعزیت کے لیے گھر سے نکلا، اچانک بغیر ارادہ بدوں (بلا) غور و فکر کے میرے دل میں یہ شعر واقع ہوا، گویا الہام من اللہ تھا: ؎

بکت العلوم بویلها وعو یلها

لوفات احمدها ابن اسمعیلها

''تمام علوم رو پڑے بہ وجہ اپنی ہلاکت ومصیبت کے، اپنے احمد ابن اسمٰعیل کی وفات کی وجہ سے۔'' (طبقات الشافعیۃ الکبریٰ، الشیخ تاج الدین ابن تقی الدین السبکیؒ)

الحاصل! دوست سے ممکن نہیں کہ اپنے دوست کی برائیاں، استہزا و تمسخر سنتا اور دیکھتا رہے اور کچھ فکر نہ کرے۔ اگر ہاتھ اور زبان اس کی مساعدت نہ کریں تو وہاں

سے کھسک جانا تو اپنے اختیار میں ہے، اور اگر اس میں بھی خوف فتنہ سمجھے تو چہرے پر کراہت کے آثار نمایاں ہونے اور دل سے بُرا سمجھنے سے کون مانع ہوتا ہے؟ اور اگر یہ بھی باقی نہ رہے تو پھر اس کی دوستی آشنائی کو بھی دونوں ہاتھوں سے سلام: ؎

رہے دشمنوں میں مگن مگن مرے حال زار پہ خندہ زن
تجھے دونوں ہاتھوں سے بندگی تیری دوستی کو سلام ہے

اضعف الایمان:

اسی لیے حدیث میں اس مرتبے کو اضعف الایمان فرمایا۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

ولیس وراء ذالك حبة خردل من الایمان

''اس کے بعد پھر ایک رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں رہتا۔''

صحیح مسلم میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت بہ ایں الفاظ موجود ہے:

سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم یقول من رأی منکم منکرا فلیغیره بیده فان لم یستطع فبلسانه وان لم یستطع فبقلبه وذالك اضعف الایمان۔ (ج ۱، ص ۵۱)

''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، آپ فرماتے تھے: جو شخص تم میں سے کسی منکر کو دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے بدل دینا چاہیے، اور اگر اس کی طاقت نہ رکھے تو اپنی زبان سے بدل دے، اور اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھے تو اپنے قلب ہی سے بدلے، یعنی دل میں برا سمجھے، اور یہ بہت ضعیف درجہ ایمان کا ہے۔''

مروان کو حضرت ابوسعید خدریؓ نے ٹوک دیا:

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کو پڑھ کر سنانے اور بیان کرنے کا واقعہ خود ہمارے مبحث میں اس امر کا کافی ثبوت ہے کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس رکن مذہب کا نہایت اہتمام کیا ہے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنے میں ان کو لوگوں کی ملامت کا خوف یا کسی ظالم بادشاہ کے ظلم کا ڈر دامن گیر ہو کر ان کو اپنے مقصد سے باز نہ رکھ سکا۔

چناں چہ صحیح مسلم (ج ا، ص ۲۹۰) میں بھی حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ خطبۂ عیدین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے بعد نماز عید ہوا کرتا تھا۔ جب خلافت مسلمین مروان پر پہنچی تو ایک روز میں مروان کے ہاتھ ہاتھ میں ڈال کر نماز عید کے لیے عیدگاہ کی طرف چلا۔ وہاں پہنچ کر دیکھا تو حضرت کثیر ابن صلت رضی اللہ عنہ نے ایک اینٹوں کا منبر گارے سے چُن لیا تھا۔ مروان نے وہاں پہنچتے ہی قبل الصلوٰۃ خطبے کے لیے منبر پر جانے کا ارادہ کیا۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے خلفاے اربعہ کے عہد تک جن آنکھوں سے خطبہ بعد الصلوٰۃ ہوتے ہوئے دیکھ چکے تھے وہ آنکھیں کب یہ تاب لاسکتیں تھیں کہ آج اس کے خلاف دین میں ایک بدعت ایجاد ہوتے ہوئے دیکھیں؟

یا تو یہ حالت تھی کہ گھر سے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر نہایت مخلص دوستوں کی طرح نکلے تھے اور یا اب فوراً تیوری بدل گئی، منکر کو دیکھتے ہی سارے علایق قطع کر دیئے اور مروان بادشاہِ وقت کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنا شروع کیا کہ کہاں جاتا ہے؟

این الابتداء بالصلوٰۃ ؟

"وہ ابتدا بالصلوٰۃ جس کو ہم اور تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے
سے دیکھتے چلے آرہے ہیں آج کہاں ہے؟"

اسے کیوں چھوڑتے ہو؟ مروان نے کہا:

لا یا ابا سعید قد ترك ما تعلم

"ابوسعید! نہیں، جو تم سمجھ رہے ہو وہ متروک ہوگیا ہے۔"

اب خطبہ قبل از نماز ہی ہوتا ہے۔ حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ ان باتوں کو کب ماننے والے تھے؟ فوراً نہایت بے باکی کے ساتھ کسی قدر سخت لہجے میں تین بار فرمایا:

کلا والذی نفسی بیدہ لا تأتون بخیر مما اعلم

"ہرگز نہیں، میں اس ذات کی قسم کھاتا ہوں جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کہ تم اُس سے بہتر نہیں لا سکتے جس کو میں جانتا ہوں (کیوں کہ وہ عملِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے)۔"

یہ کہہ کر لوٹ آئے اور حدیث مذکور من رأی منکم منکرا الخ لوگوں کو سنا دے، تا کہ مروان کو اس اختراع فی الدین سے روکیں۔ درحقیقت یہ سارے کرشمے اس کے ہیں کہ ان حضرات کی محبت بھی اللہ کے لیے ہوتی تھی اور غصہ وغضب بھی اسی کے لیے۔ یہ حکم خدا اور رسول کے خلاف کے شایبے کو بھی ٹھنڈے دل سے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ یہاں تو فی الواقع یہ ایک منکر اور احداث فی الدین تھا۔ یہ لوگ جس بات کو ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن لیتے تھے وہ ان کے قلب پر پتھر کی لکیر ہو جاتی تھی۔ اب اس کے خلاف کسی کی بات اگرچہ وہ فی الواقع صحیح بھی ہو، اُن کے قلب پر بہ مشکل مؤثر ہوتی تھی۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو ٹوک دیا:

چناں چہ حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ ہی کا واقعہ ابو داود (ص ۲۳۵) میں مذکور ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں صدقۃ الفطر جو اور چھوارے اور کش مش سب چیزوں کا ایک ایک صاع کامل نکالتے تھے (۱) اور پھر بعد وفات آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہم اسی طرح ان سب چیزوں میں سے ایک صاع کامل نکالتے رہے۔ یہاں تک کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ حج یا عمرہ کرنے کے لیے مکہ میں تشریف لائے اور بر سر منبر آپ نے وعظ فرمایا، اثنائے وعظ میں فرمایا کہ صدقۃ الفطر اور تمام چیزوں کا تو پورا ہی صاع ہے، مگر گیہوں کا نصف صاع کافی ہے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کے کان اس وقت تک اِس سے نا آشنا تھے۔ وہ سمجھے ہوئے تھے کہ صدقۃ الفطر میں نصف صاع کی کوئی مقدار ہی نہیں، اس لیے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اِس حکم کو خلاف حکم رسولِ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سمجھ کر حق اُسی کو سمجھا جو خود سن چکے تھے۔ پھر وہ کون سی طاقت تھی جو ان کو حق گوئی سے روکتی؟ فوراً کھڑے ہو گئے اور بے دھڑک بول اُٹھے:

اما انا فلا ازال اخرجه ابدا ما عشت

''بہر حال میں تو ہمیشہ اسی (صاع کامل) کو نکالتا رہوں گا (جو خود سُن چکا ہوں) جب تک میں زندہ ہوں۔''

---

(۱) صاع عرب میں ایک پیمانہ مستعمل تھا، جس میں تقریباً پونے چار سیر اناج سماتا تھا۔ صاع آج کے اعشاریہ نظام میں 3.149.28 کلوگرام بنتا ہے۔ (شریفی)

حال آں کہ درحقیقت یہاں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ خود فرما چکے تھے:

صاع من براو قمح علي كل اثنين

''ایک صاع گیہوں کا دوآدمیوں کی جانب سے دیا جاسکتا ہے۔''

جس سے خود بہ تصریح معلوم ہوتا ہے کہ ایک آدمی کی جانب سے گیہوں کا نصف صاع (آدھ پاؤ ڈیڑھ سیر) کافی ہے، اور دوسرے تمام صحابہ رضوان اللہ علیہم کا سکوت فرمانا بھی اس کی دلیل ہے کہ یہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی طرف سے نہ کہا تھا بلکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود فرما چکے تھے، مگر یہ حدیث حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کو نہ پہنچی تھی۔ بہر حال اس خصوصیتِ مسئلے میں حضرت ابو سعید حق پر ہوں یا نہیں، مگر اس واقعے سے اتنی بات بہ خوبی واضح ہوگئی کہ وہ جس حکم کو بہ زعم خود حکم خدا اور رسول جانتے تھے اس کا کس درجے اتباع کرتے، اور اس کے خلاف پر انہیں دنیا کی کوئی طاقت مجبور نہ کر سکتی تھی۔

یہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کے ایک دو واقعے ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے حالات اُٹھا کر دیکھیے تو سب کو اس بارے میں بعضهم نظائر بعض پائیں گے۔

چوتھا باب

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا حکم کیا ہے؟

اِن آیات اور احادیث سے جو بہ قدر کفایت نقل کی جا چکیں، اجمالاً اتنی بات تو متیقن (یقینی) ہوگئی کہ قرآن و حدیث نے امر بالمعروف کو دین کا رکن اعظم قرار دے کر اُس کی تاکید مزید اور ترک پر وعید شدید فرمائی ہے، مگر اس وقت یہ امر باقی ہے کہ فتوے میں اس کا کون سا مرتبہ ہے؟ فرض ہے یا واجب، سنت ہے یا مستحب؟ اور اگر واجب ہے تو ہر شخص پر ہر حال میں یا اس سے بعض اشخاص اور حالات مستثنیٰ ہیں؟

امام الحرمین اور امام نووی[1] اور امام غزالیؒ[2] رحمہم اللہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی فرضیت پر اجماع اُمت نقل فرماتے ہیں، جو علاوہ آیات قرآنیہ اور احادیث کے خود بھی مثبت احکام شرعیہ ہے، تو اب اس کی فرضیت کتاب وسنت و اجماع اُمت سے ثابت ہوگئی۔ اہل سنت والجماعت میں سے کسی نے اس کا خلاف نہیں کیا۔ البتہ بعض روافض سے منقول ہے کہ ان کے نزدیک سوائے اس شخص کے جو خود تمام معاصی سے معصوم ہو، اور کسی کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حق حاصل نہیں، اور چوں کہ اس وقت کوئی معصوم عن المعاصی دنیا میں بہ اتفاق موجود نہیں، اس لیے امر بالمعروف

---

(۱) شرح مسلم: ج ۱، ص ۵۱ (۲) احیاء العلوم: ج ۲، ص ۳

اور نہی عن المنکر کا اس وقت کسی کو حق نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ قرب قیامت میں امام معصوم ظاہر ہوں گے اور آ کر سلسلۂ امر بالمعروف کو قایم کریں گے، ان سے پہلے امر بالمعروف کا حکم نہیں۔ (کذا ذکرہ الغزالی فی الاحیاء: ج ۲)

ایک غلط فہمی کا ازالہ:

مگر یہ روافض میں بھی ایک ایسا غیر معتد بہ طائفہ قلیلہ ہے جو بعد انعقاد و اجماع اُمت پیدا ہوا ہے، اس لیے ان کا خلاف مخل اجماع نہیں ہوسکتا۔ امام نوویؒ ان کے بارے میں ابوالمعالی امام الحرمینؒ سے نقل فرماتے ہیں:

لا یکترث بخلافھم فی ھذا فقد اجمع المسلمون علیه قبل ان ینبغ ھولاء.

"ان کے خلاف کا اعتبار نہ کیا جائے گا، اس لیے کہ مسلمانوں نے ان کے پیدا ہونے سے پہلے امر بالمعروف کی فرضیت پر اجماع کرلیا تھا۔"

یہ فرقۂ ضالہ ضلالت کے ساتھ غباوت کو امام مقلد بنا کر آیت کریمہ:

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ (سورۂ بقرہ: ۴۴)

"کیا تم لوگوں کو نیکی کا امر کرتے ہو اور اپنے نفسوں کو بھولے ہوئے ہو؟"

اور آیت کریمہ:

كَبُرَ مَقْتاً عِنْدَاللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (سورۂ صف: ۳)

"عنداللہ بڑی غصے کی بات ہے کہ تم لوگوں سے وہ کہو جس کو تم خود نہیں کرتے۔"

اور اس کی امثال آیات سے استدلال کرتے ہیں جو بہ ظاہر اس پر دال ہیں کہ اس شخص کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا ناجایز ہے جو خود اس کے موافق عمل نہ کرتا

ہو۔

مگر درحقیقت اس کا منشا غباوت (کم فہمی) ہے، کیوں کہ اس شخص میں جو باوجود خود عامل نہ ہونے کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا ہے دو حیثیتیں ہیں، ایک تو خود اس فعل کو نہ کرنے کی، دوسری لوگوں کو اس کا امر کرنے کی۔ سو آیات مذکورہ اور ان کی امثال میں وعید حیثیت اولیٰ پر ہے نہ کہ حیثیت ثانیہ پر، یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر وعید نہیں بلکہ ان کے خود اس فعل سے عاری ہونے پر ان کو عار دلائی جاتی ہے اور بہ صیغۂ تعجب کہیں کہا جاتا ہے کہ کیا یہ بھی ہوسکتا ہے؟ اوروں کو تو معروفات کا کوئی شخص امر کرتا ہے اور خود نہ کرے، کیوں کہ ہر عاقل کو اپنی نفس کی اصلاح وحفاظت دوسروں سے مقدم ہوتی ہے، اور کہیں فرمایا جاتا ہے کہ وہ شخص عنداللہ نہایت مبغوض ہے جو دوسروں کو امر بالمعروف کرتا ہے اور خود (عمل) نہیں کرتا۔ تو اب ہر وہ عاقل جسے عقل کا کچھ حصہ ملا ہے سمجھ سکتا ہے کہ اس کی غرض یہی ہے کہ حتی الوسع خود بھی سعی کرو کہ منکرات سے بچو اور معروفات (نیکیوں) کو اختیار کرو اور دوسروں کو بھی اس کی طرف بلاؤ، نہ یہ کہ ایک کے ساتھ دونوں کو چھوڑ بیٹھو۔

اور اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے خود بھی اس پر بالکلیہ عامل ہونا شرط ہے، تو پھر کوئی ان سے یہ تو پوچھے کہ آیت کریمہ:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (سورۂ آل عمران:۱۰۴)

”اور چاہیے کہ رہے تم ایک جماعت ایسی جو بلاتی رہے نیک کام کی طرف

اور حکم کرتی رہے اچھے کاموں کا اور منع کریں برائی سے اور وہی پہنچے اپنی مراد کو۔"

میں لفظ مِنْكُمْ کے مخاطب کون ہیں؟ بالکل صاف اور ظاہر ہے کہ خطاب تمام امت کو ہے۔ چناں چہ مفسرین کا اسی پر اجماع واقع ہے۔ خصوصاً جب کہ آیت کریمہ:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (سورۂ آل عمران: ۱۱۰)

"تم ہو بہتر سب امتوں سے جو بھیجی گئی عالم ہیں۔ حکم کرتے ہو اچھے کاموں اور منع کرتے ہو برے کاموں سے۔"

بہ صراحت بتلا رہی ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مخاطب جمیع مسلمین امت ہیں، اور سب امر بالمعروف کے مامور ہیں۔ پھر کیا کوئی شخص جس کے حواس درست ہوں، یہ کہہ سکتا ہے کہ تمام اُمتی تمام معروفات پر عامل اور منکرات سے مجتنب ہیں؟ ان سے کوئی معصیت صادر نہیں ہوتی؟ سب کے سب معصوم ہیں؟ حاشا وکلا! اولیا بلکہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی معصوم نہیں ہیں۔

الغرض اگر نہی عن المنکر کے لیے شرط ہو کہ نہی خود بھی اجتناب اور پرہیز کرتا ہو تو چوں کہ تمام منکرات سے واجب ہے اس لیے نہی عن المنکر کے لیے تمام منکرات سے بچنا شرط ہوگا، جو معصوم کی شان ہے۔ اس لیے اب وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اور كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ الخ کے خطابات خاکم بدہن بالکل بے ہودہ اور فضول ہو جائیں گے اور روئے زمین پر کوئی امر بالمعروف کرنے والا باقی نہ رہے گا؟

حضرت سعید ابن جبیرؒ کا قول:

چناں چہ حضرت سعید ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے:

ان لم یأمر بالمعروف ولم ینه عن المنکر الامن لا یکون فیه شئ لم یامر احد بشئ فاعجب مالکاً ذالك من سعید ابن جبیر.

''اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس شخص کے سوا کوئی نہ کیا کرے جس میں کوئی عیب نہ ہو تو دنیا میں کوئی شخص کسی چیز کا امر نہ کر سکے۔ حضرت امام مالکؒ کو حضرت سعید ابن جبیرؒ کا یہ قول پسند آیا۔''

غیر عامل اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر:

تفسیر نیشاپوری (برحاشیہ ابن جریر: ج ۴، ص ۳۲) میں ہے:

وعن بعض السلف مروا بالخیر و ان لم تفعلوا (تفسیر نیشاپوری: ج ۴، ص ۳۲)

''بعض سلف سے روایت ہے کہ تم امر بالمعروف کرو، اگر چہ خود بھی نہ کر سکو۔''

اس بیان سے بہ وضاحت ثابت ہو گیا کہ آیت کریمہ: کَبُرَ مَقْتاً عِنْدَ اللّٰهِ الخ وغیرہ سے اس امر پر استدلال کرنا کہ بدوں (بلا) خود عامل ہونے کے دوسروں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا جائز نہیں، حلاوت فہم اور نصوص سے جہالت پر مبنی ہے۔

ہاں یہ لوگ کبھی استدلال میں یہ قیاس بھی پیش کیا کرتے ہیں کہ یہ شخص جو خود گناہوں میں ملوث اور معاصی میں مبتلا ہے دوسروں کو کیسے گناہوں سے پاک کر سکتا ہے؟ کہیں ممکن ہے کہ نجس پانی ایک نجس کپڑے کو پاک کر دے؟ ناپاک پانی تو جوں جوں کپڑے پر ڈالو گے اس کی نجاست میں اضافہ ہی ہوتا رہے گا۔ پھر کیسے ہو سکتا ہے

کہ وہ شخص جو خود گم راہ ہے دوسرے کو راہ ہدایت پر لا سکے؟ جو شخص اپنی ذات کو نفع نہیں پہنچا سکتا اور خود اپنی ذات کے درپے آزار ہے اس سے کسی دوسرے کو نفع کی توقع رکھنا اگر جنگل کے چمکتے ہوے ریت سے پیاس بجھانے کی توقع نہیں ہے تو کیا ہے؟ ع

او خویشتن گم است کرا رہبری کند

اور سطحی نظر میں ان کی یہ مہمل تقریر کسی قدر باوقعت بھی معلوم ہوتی ہے۔ اذہان متوسطہ ابتداً اس کے رد کے بھی درپے نہیں ہوتے، لیکن جب فہم سلیم اس کی قلعی کھولتی ہے اور اس کے تار پود اُدھیڑ کر رکھ دیتی ہے تو پھر تار عنکبوت کی ہستی سے زیادہ اس کی ہستی نظر نہیں آتی۔

ان سے کوئی یہ تو پوچھے کہ اس شخص میں معاصی اور گناہوں کے ساتھ ملوث اور نجس کیا چیز ہے؟ اور جس سے یہ دوسرے کو پاک کرنا چاہتا ہے وہ کیا ہے؟ بالکل ظاہر ہے کہ گناہوں سے ملوث اور نجس اگر ہے تو اس کی ذات اور اس کا نفس ہے، مگر ساتھ ہی یہ بھی اظھر من الشمس (سورج کی روشنی کی طرح واضح) ہے کہ یہاں دوسروں کی تطہیر اور پاکی کا ذریعہ اس کی ذات نہیں بنتی، بلکہ اس کا ذریعہ تو اس کا وہ قال اللہ وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے جس کو یہ آپ کے سامنے بہ وقت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تلاوت کرتا ہے، اور العیاذ باللہ اس کی ذاتی نجاست ان آیات اور احادیث یا آثار میں تو سرایت نہیں کر گئی جن کو یہ بیان کرتا ہے۔ الحاصل ہم نے مانا کہ ایک ناپاک دوسرے ناپاک کو طاہر نہیں کر سکتا، مگر یہاں بھی کوئی کسی نجس چیز سے نجس کو پاک نہیں کرتا۔ یہاں تو تطہیر کے لیے قرآن اور حدیث رکھا گیا ہے، جس کے نزول کی علت غائی تطہیر اور تزکیے سے متجاوز نہیں:

وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا (سورۂ احزاب: ۳۳)

''اور تم کو خوب پاک کردے۔''

اسی طرح ایک گم راہ سے ممکن ہے کہ دوسرے گم راہ کو راستے پر لگادے، کیوں کہ اگر دو شخص ہوتے ہیں، ایک تو وہ جو بے چارہ راستے سے واقف نہیں تھا، کسی متشابہ راستے پر آکر بھٹک گیا۔ پہاڑوں اور جنگلوں میں ٹھوکریں کھانی پڑیں، اور ایک کج طبع ہوتا ہے جو راستے سے خوب واقف ہے اور اس کے نشیب و فراز کو پہچانتا ہے، مگر طبع زیغ اور کجروی کے ہاتھوں مجبور و معذور ہے۔ اس کی کج طبعی یا منزل مقصود پر پہنچنے ہی کو بہتم بالشان اور ذی وقعت وعظمت نہ سمجھنا، اسے مقصود کے جادۂ مستقیم سے یمیناً وشمالاً (دائیں بائیں) لیے پھرتا ہے۔ یہ دوسری قسم کا گم راہ گو خود کتنا ہی منزل مقصود سے بعید ہو مگر دوسرے شخص کو منزل پر پہنچانے کے لیے بلا ریب کافی ہے۔

ایسے ہی یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ ایک شخص اپنی ذات کے لیے درپے آزار ہو اور دوسرے کو اس سے نفع عظیم پہنچے۔ اس حاذق طبیب کی حالت کا مشاہدہ جو حالت مرض میں خود اگرچہ کتنی ہی بد پرہیزی کرتا ہے مگر دوسرے مریض اس کے مجرب نسخوں سے صحت یاب اور تن درست ہو رہے ہیں، ہمارے کلام کی بین اور مشاہد دلیل ہے۔

ولنعم ماقیل:۔

وغیر تقي یامر الناس بالتقی

طبیب یداوی الناس وهو مریض

''غیر متقی جو دوسروں کو تقوے کی ترغیب دیتا ہے وہ ایک طبیب ہے جو لوگوں کا علاج کرتا ہے اور خود بیمار ہے۔''

چراغ کو دیکھیے کہ خود سرتاپا سوز ہے مگر دوسروں کے لیے نافع اور ضیا افروز ہے۔

کبھی دین کی نصرت فاسق فاجر سے بھی لے لی جاتی ہے:

الغرض امر بالمعروف اس شخص پر بھی واجب ہے جو خود اپنے قول پر عامل نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کبھی اپنے دین کا کام ایک فاسق وفاجر سے لے لیتا ہے۔ خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

ان اللّٰہ لیوید ھذا الدین بالرجل الفاجر

''البتہ اللہ تعالیٰ کبھی ایک فاجر آدمی سے اس دین کی تائید کرا دیتا ہے۔''

اور کچھ عجیب بات ہے کہ اِس دین محمدی علی صاحبہ الف صلوٰۃ میں تو ابتدا سے یہی ہوتا چلا آیا ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک یتیم بچے تھے، ہوش سنبھالنے سے پہلے والد کی فرقت کا داغ کھا چکے تھے، اور تمام روسائے مکہ حتیٰ کہ عزیز وقریب آپ کی دشمنی پر کمربستہ اور قتل پر آمادہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے دشمن ایک کافر ابوطالب سے آپ کی حمایت اور آپ کے دین کی تائید کا کام لیا، اور پھر جب ابوطالب انتقال کر گئے تو چند روز کے لیے اسی ابولہب کو جو آپ کے اعدا (دشمنی) میں اشد کفار تھا اور اسی پر مرا، جس کے نام پر ہم آج تک قرآن میں:

تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَھَبٍ وَّتَبَّ

''ابولہب کے ہاتھ بے کار ہوں۔''

کی بددعا پڑھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی حمایت اور تقویت کے لیے کھڑا کر دیا۔

---

(۱) حضرت مفتی صاحبؒ کی اس تحریر سے دو اشکال پیدا ہو رہے ہیں: ایک یہ کہ جناب ابوطالب کا احترام مسلمانوں میں نہیں ہے۔ دوسرے ابولہب نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت کی یعنی دین اسلام کے لیے کمربستہ ہو گیا۔ حال آں کہ دونوں باتیں تاریخ کی روشنی میں غلط ہیں۔ حضرت ابوطالب بے شک کافر ہی رہے، لیکن حضور علیہ السلام سے تعلق اور اہل اسلام کی خدمت کی وجہ سے مسلمانوں میں ہمیشہ ان کا احترام رہا۔ ابولہب نے کبھی حضور علیہ السلام کی بعثت کے بعد حمایت نہیں کی۔ اس کا احترام مسلمانوں میں کبھی نہیں رہا۔ ورنہ سورۂ لہب کے

[illegible]

(طبقات ابن سعد: ص ۱۴۵)

بے شک: ع

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد[1]

اور پھر ہمیشہ فساق و فجار منافقین آپ کے ساتھ غزووں میں شریک ہوتے رہے۔ خداوند تعالیٰ نے اپنے دین کی تائید کا کام ان سے لے لیا، اور کیا عجب ہے کہ اللہ تعالیٰ امر بالمعروف کی برکت سے اس کو بھی عمل کی توفیق عطا فرمادے۔ چناں چہ تجربہ شاہد ہے کہ کچھ نہ کچھ اپنے قلب پر اثر ہوتا ہے۔ یہ محض ابلیس لعین کی تلبیس ہے کہ ادھر اس شخص کے دل میں تو یہ وسوسہ پیدا کرتا ہے کہ جب تو خود اپنے قول پر عامل نہیں تو خود ہوائے نفسانی کی پرستش میں مصروف ہے، تو تیرا کیا منہ ہے کہ کسی دوسرے کو معروفات کا امر کرے؟ یا ان باتوں سے منع کرے جن میں خود مبتلا ہے؟ یہاں تک کہ یہ وساوس اس کے قلب پر مستولی (قابو) ہوجاتے ہیں، اور اس کے ہاتھ کو منکرات کے مٹانے اور اس کی زبان کو اظہار حق سے روک دیتے ہیں، اور پہلے اگر ایک گناہ کا مرتکب تھا تو اب دو گناہ کا مجرم ہوگیا۔ ایک خود منکرات سے نہ بچنا، دوسرے اوروں کو منع نہ کرنا۔ چناں چہ تفسیر نیشاپوری میں ہے:

وعن الحسن انه سمع مطرف ابن عبدالله يقول لا اقول مالا افعل قال وأينا يفعل ما يقول. ودّ الشيطان لم ظفر بهذه منكم فلا يأمر احد معروفا ولا ينهى عن منكر.

(ج ۴، ص ۳۲)

”اور حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ انہوں نے مطرف ابن عبداللہ کو یہ کہتے ہوئے پایا کہ میں تو وہ بات (لوگوں سے) نہ

کہوں گا جس کو میں خود نہیں کرتا۔ فرمایا کہ (پھر) ہم میں ایسا کون ہے جو اپنی ساری مقولات پر عمل کرتا ہو؟ (حقیقت یہ ہے) کہ شیطان کا اس سے مطلب یہ ہے کہ کسی طرح اس کام میں تمہارے سے کامیابی حاصل کرے۔ پھر کوئی نہ کسی اچھے کام کا امر کرے گا اور نہ کسی گناہ پر روکے گا۔"

شیطانی وسوسہ:

حقیقت میں شیطان کا مقصود اِس وسوسے کے پیدا کرنے سے یہی ہے کہ ایسا تو کوئی ہو نہیں سکتا جو تمام معروفات پر عمل اور تمام منکرات سے اجتناب کرتا ہو۔ پھر اگر امر بالمعروف کے لیے خود بھی اس پر عامل ہونا شرط ہو تو دنیا میں نہ کوئی کسی کو نیک صلاح دے گا اور نہ کسی معصیت کے ارتکاب سے منع کرے گا، تا کہ پھر اس اندھیر نگری میں بلا نزاع ودفاع اِس ملعون کی خوب پرستش ہو۔ آخر سب کو وہ ہی دن دیکھنا ہو جو اس لعین نے ان سے سابقین بنی اسرائیل کو دکھلایا، جن کی تباہی و بربادی کا مہیب تخیل آج تک بدن میں لرزہ پیدا کر دیتا ہے۔

اور ادھر سادہ لوح عوام کے دماغوں میں یہ خیال پکا دیا کہ جو شخص خود گم راہ ہو وہ دوسرے کو کیسے راہ نجات بتلا سکتا ہے؟ ان کے آزادی پسند نفوس کو زمانہ حال کی "مصطلح حریت" قید مذہب سے آزاد ہونے کے لیے ایک بہانہ ہاتھ آیا۔ کسی کی بات پر کان دھرنے یا کسی کے قول پر عمل کرنے کے لیے یہ معیار مقرر کر لیا کہ پہلے اس قایل اور امر بالمعروف کے ابتدائے خلقت سے اس وقت تک کے تمام افعال واقوال، حرکات وسکنات کا جایزہ لے لیں، پھر ان کی نقادنہیں بلکہ عیب جو نظر سے کسی بشر کا مصاحب سے سالم رہنا ہر شخص جانتا ہے کہ کیا کچھ مستبعد ہوگا۔ اب اگر ان کو اس کے کسی سابق

گناہ اور خطا پر بھی اطلاع ہو گئی تو ان کو اس کے قول پر عمل نہ کرنے کے لیے دستاویز مل گئی نہ اب اِس جرم میں کہ یہ تمام معاصی سے معصوم کیوں نہیں بنا؟ اور کل اس سے فلاں خطا یا گناہ سرزد کیوں ہوا ہے؟ اس کا قول بھی قابل عمل نہ رہا۔ حال آں کہ اول تو یہی ضروری نہیں کہ وہ عنداللہ اس وقت تک اس گناہ کا مجرم معاصی اور خطا کار ہے، اس نے اِس سے توبہ نہیں کر لی یا خداوند عالم کی مغفرت عامہ نے اسے محو نہیں کر دیا:۔

گناہ آئینہ عفو رحمت است اے شیخ

مبیں بہ چشم حقارت گناہ گاراں را

اسی لیے بزرگوں نے کہا ہے:۔

آدمی را بہ چشم حال نگر

از خیال پری و دی بہ گذر

اور پھر اگر بالفرض وہ اس وقت بھی اس گناہ کا مرتکب ہے تو اس کے قرآن و حدیث نے تو کوئی گناہ نہیں کیا، جس کو وہ آپ کے سامنے پڑھتا ہے اور اس کے اوامر کے ارتکاب اور مناہی سے اجتناب کی طرف آپ کو بلاتا ہے، پھر اسے کیوں چھوڑا جائے؟ وہ اپنی جانب سے تو آپ کو کوئی امر نہیں کرتا، وہ اس وقت اللہ اور اس کے رسول کا ایک قاصد ہے، جو کچھ انھوں نے فرمایا وہ اس نے آپ کے سامنے لا کر رکھ دیا۔ اس کی مثال تو اس وقت بعینہ یہ ہے:۔

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند

آں چہ اُستاد ازل گفت بہ گوی گویم

اس وقت اس کے قول پر عمل نہ کرنا اور تمرد و عصیاں کے ساتھ پیش آنا در حقیقت

خدا تعالیٰ اور اس کے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نافرمانی اور عدول حکمی ہوگی۔ اس لیے بزرگوں نے کہا ہے:

التهاون بالمأمور من قلّة المعرفة بالآمر

''مامور کو حقیر سمجھنا عظمت آمر کی عدم واقفیت کی وجہ سے ہوتا ہے۔''

بے شک اگر آمر کی عظمت و وقعت قلب میں سما جائے تو اسے مامور اور قاصد کی صورت میں آمر کی جھلک دکھلائی دینے لگے۔ اس کے دل میں مامور کے قول کی وہی وقعت ہو جو آمر کے قول کی اس کے نزدیک ہے۔

اور پھر کسی آمر اور اس کے امر کی عظمت و وقعت کسی انسان کے قلب میں دو ہی وجہ سے ہو سکتی ہے، یا تو اس سے عشق ہو، محبت نے اس کے سویدائے قلب میں پہنچ کر وہ تسلط قایم کیا ہو کہ اعضا و جوارح اس کے شاہد بن گئے ہوں۔ اُس کے ہاتھ پیر خلاف پر اُٹھ نہ سکتے ہوں، اور یا اس کے حاکمانہ تسلط اور جابرانہ قوت کے خوف سے اس کی اطاعت کے بغیر مخلص نہیں سمجھتا۔ الغرض ایسی اطاعت اور فرماں برداری کہ اس کے امر کو واجب العمل سمجھے اور وقعت کی نظر سے دیکھے یا محبوب کی ہو سکتی ہے اور یا حاکم کی۔

اور ہم ان دونوں صورتوں میں کسی کو نہیں دیکھتے کہ مامور اور قاصد کے حالات کی تفتیش اور پڑتال کرتا ہو کہ یہ کس مرتبے کا آدمی ہے؟ خود بھی امر کے احکام کی اطاعت اور فرماں برداری کرتا ہے یا نہیں؟ بلکہ بلا پس و پیش امتثال آمر کے لیے آمادہ اور مستعد ہو جاتے ہیں، اور کیا کسی محبت کا دعویٰ رکھنے والے سے ممکن ہے کہ ایک شخص محبوب کا پیغام لے کر آئے اور وہ بجائے اس کے کہ بے تامل فرماں برداری کے لیے

کمر بستہ ہو جائے؟ محبوب کے قاصد پر نکتہ چینیاں شروع کر دے؟ نہیں اور ہرگز نہیں۔ کیا اسے محبوب کا نام سننے کے بعد قاصد کی صورت میں محبوب کی صورت نظر نہ آئے گی یا قاصد کا کلام بعینہ محبوب کا کلام معلوم نہ ہوگا؟ قاصد تو بڑا مرتبہ رکھتا ہے، اسے تو ہر چیز سے جس کو محبوب سے کسی درجے میں تعلق ہو محبت ہو جانا لازمی ہے: ع

مراعات صد کن برائے یکے

مجنوں اس کتے کے پیر چوم لیتا تھا جو لیلیٰ کے کوچے سے گزرا ہو: ؎

پائے سگ بوسید مجنوں گفت خلقت ایں چہ بود
گفت ایں سگ گہ بہ گہ سر در کوئے لیلیٰ رفتہ بود

عاشق کی شان اور محبوب کا تعلق:

بلکہ عاشق کی شان تو یہ ہوتی ہے کہ جس پر محبوب کے تعلق کا شبہ بھی ہو جاتا ہے وہ اس کو بھی اسی نظر سے دیکھتا ہے جس سے محبوب کے حقیقی اور سچے متعلقین کو اس کے مشتاق اور منتظر نگاہیں اسے کب مہلت دیتی ہیں کہ وہ اصلی واقعے کی تحقیق کرے۔ چناں چہ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ وہ گھر میں داخل ہوئے تو اپنے ایک غلام کو دیکھا کہ نہایت خشوع وخضوع سے نماز پڑھ رہا ہے۔ ان کو اس کا اپنے حقیقی مولیٰ کی خدمت میں دست بستہ مشغول ہونا پسند آیا، اور اس کو خالصتاً للہ آزاد فرما دیا۔ دوسرے غلاموں نے جو یہ ماجرا دیکھا تو اس پر رشک ہوا، ان کو غلامی کی قید سے چھوٹنے کا یہ آسان طریق معلوم ہی ہو گیا تھا، انہوں نے بھی بہ تکلف و تصنع حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کے سامنے بڑی بڑی سورتوں کی قرأت اور طویل وعریض رکوع وسجدے شروع کر دیئے۔ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما

اگرچہ خوب واقف تھی کہ بناوٹ اور تصنع ہے، یہ جبیں سائی (عجز و انکسار) حقیقتاً خدا تعالیٰ کے لیے نہیں بلکہ آزادی کے لیے ہے، مگر اپنی عادت مقرر فرمائی کہ جب کسی غلام کو ایسی حالت میں پاتے تو فوراً آزاد کر دیتے۔ لوگوں نے یہ حال دیکھ کر عرض کیا کہ حضرت! یہ سب ریاکار ہیں، آپ کو دکھلانے اور غلامی کی قید سے رہائی پانے کے لیے خشوع و خضوع ظاہر کرتے ہیں۔ آپ بے تامل ان کو آزاد نہ کیجیے۔ فرمایا:

من خدعنا في الله انخدعنا له (مستطرف: ج ا،ص ۱۰۶)

''جو شخص ہمیں اللہ تعالیٰ کے معاملے میں دھوکا بھی دیتا ہے تو ہم جان کر اس کے دھوکے میں آجاتے ہیں۔''

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما چوں کہ خداوند عالم سے حقیقی عشق رکھتے تھے، اس لیے انہیں شرم آتی تھی کہ جو خاصان خداوند عالم کی صورت میں آئے اس سے خدمت لیں اور اپنا غلام رکھیں۔ انہیں مقربین بارگاہ خداوندی کی صورت کا بھی یہاں تک ادب ملحوظ تھا۔ الحاصل کسی محبت کے مدعی سے ممکن نہیں کہ کسی سے احکام خداوندی سن کر بے تامل امتثال کے لیے کمربستہ نہ ہو جائے، اور مبلغ کے اعمال و اقوال کی جانچ پڑتال شروع کر دے۔

اسی طرح حکام دنیا کی چپڑاسیوں اور سپاہیوں کے کلام کو ہم بالکل حکام کا کلام سمجھتے ہیں۔ ہمیں ان کے قالب میں حکام کی صورتیں دکھائی دیتی ہیں، جو وہ کہہ دیتے ہیں ہم اس کے لیے اسی طرح گردن تسلیم خم کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ جس طرح حکام کے سامنے ہم نہیں دیکھتے کہ یہ ایک پانچ روپیہ کا چپڑاسی ہے، نہ کوئی ذی عزت ہے اور نہ صاحب مال، یہ ہمارا کیا کر سکتا ہے؟ ہمیں دھیان بھی نہیں ہوتا کہ

دریافت کرلیں کہ یہ خود بھی اپنے حاکم کے اوامر کا مطیع اور پیرو ہے یا نہیں؟ کیوں کہ حکام کی عظمت و ہیبت ہمارے قلوب پر چھائی ہوتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اگر چپراسی کے لائے ہوئے سمن کی تعمیل نہ کی تو وارنٹ ہمارے نام پر جاری ہو جائے گا اور پھر طوعاً وکرہاً "پابہ دست دگرے دست بہ دست دگرے" حاضر ہونا پڑے گا۔

الغرض چوں کہ قلب میں حکام کی عظمت و وقعت سمائی ہوتی ہے، ہماری نظر قاصد اور چپڑاسی کے حالات پر نہیں پڑتی، اور چپڑاسی تو کچھ حقیقت بھی رکھتا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ بعض مرتبہ کسی سرکاری حکم کا اعلان منادی کے ذریعے سے کیا جاتا ہے[1]، اور منادی کرانے والے عموماً خاک روب بھنگی وغیرہ ہوتے ہیں، جن کے قرب سے بھی انسان کو طبعاً نفرت اور وحشت ہوتی ہے، مگر آپ نے کسی کو نہ دیکھا ہوگا کہ اس حکم کے ماننے اور تسلیم کرنے سے بہ ایں وجہ انکار کرے کہ اس کا لانے والا ایک حقیر و ذلیل آدمی ہے، اور یہ سب در حقیقت اسی کا نتیجہ ہے کہ حکام کی عظمت و وقعت ہمیں مہلت نہیں دیتی کہ قاصد کے حالات پر غور کریں۔ ٹھیک اسی طرح سمجھیے کہ حضرات علما اور اولیاے آمرین بالمعروف حضرت کبریا وجلال اور بارگاہ رسول کے چپڑاسی ہیں۔ ان کو دعوت اسلام کے سمن دے کر لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہے۔ یہ اپنی ذات سے کیسے ہی مفلس و نادار بے سطوت و دولت ہوں مگر جس وقت اپنے اداے منصب و فرض (تبلیغ احکام خداوندی) پر ہوتے ہیں تو ان کی شان کچھ اور ہوتی ہے۔ ان کو بڑے بڑوں پر حکم رانی کا حق ہوتا ہے:

---

(۱) بادشاہوں کے دور میں منادی گلی محلے میں اعلان کرتا پھرتا تھا، اب جب میڈیا کا دور آ گیا تو اخبارات، ریڈیو، ٹی.وی پر اعلانات منادی میں شامل ہو گئے۔ (شریفی)

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں
کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

پھر کیا وجہ کہ خدا اور رسول کے چپڑاسیوں اور سپاہیوں کا آپ پر اتنا بھی اثر نہ ہو جتنا ایک دنیوی حاکم کے چپڑاسی کا؟ درحقیقت اس کا منشا دنیوی حکام کی طرح خدا و رسول کی عظمت وجلال پر کامل یقین اور اس کے عذاب کا خوف نہ ہوتا ہے:

مَا قَدَرُو اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ (سورۂ انعام:۹۱)

''اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی قدر نہ کی جیسا کہ حق تھا۔''

شیطان کا مکر:

الحاصل! یہ شیطان کا مکر عظیم ہے کہ ادھر تو علما کے دل میں یہ وسوسہ پیدا کرتا ہے کہ جب ہم خود اس پر عامل نہیں تو دوسرے کو کیا امر (حکم) کریں؟ اور ادھر عوام کو یوں پھسلاتا ہے کہ جب کہنے والا خود ہی اس پر عمل نہیں کرتا تو ہم بھی معذور ہیں۔ جس سے اس لعین کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ یہ مبارک سلسلہ بالکل چھوٹ جائے اور بجائے اتباع قرآن وحدیث خواہشات کا اتباع ہونے لگے۔ اس لیے شریعت نے دونوں جانب کو سنبھالنے کے لیے ایک عجیب نظام مقرر فرمادیا کہ اگر اس پر عمل کیا جائے تو پھر قیامت تک کسی مفسدہ کے پیش آنے کا اندیشہ نہیں۔ ادھر تو علما کو کہیں مراتب دنیوی واُخروی اور فوز دارین کی طمع دے کر اور کہیں ترک پر وعید شدید سے ڈرا کر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جاری رکھنے کا امر فرمایا کہ اگر وہ خود کسی منکر میں مبتلا ہیں تو ترک نہی عن المنکر کا گناہ مفت سر پر نہ لیں، اور ادھر عوام کو:

خذ ما صفا ودع ما کدر

''اچھی باتیں لے لو اور بُری باتیں چھوڑ دو۔''

کی تعلیم فرمائی کہ عقل مند کی نظر نفس قول یا فعل پر ہونی چاہیے کہ یہ اچھا ہے یا بُرا، نہ کہ کہنے والے اور کرنے والے کے حالات پر۔ پھر اگر کوئی اچھی بات ہے تو اس کو اختیار کرے اور لازم پکڑ لے، اگر چہ اس کا کہنے والا کتنا ہی بدکردار اور بدعمل ہو: ؎

عاقل آں ست گو بہ گیر و گوش

در نوشت ست پند بر دیوار

اور اگر فی الواقع کوئی منکر اور بُری بات ہے تو اس سے بچے اور کوشش کرے کہ اس میں مبتلا نہ ہو، اگر چہ کتنے ہی بڑے ولی اور باخدا شخص کو اس میں مبتلا پائے، اور یہی معنی ہیں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان

کلمة الحکمة ضالة الحکیم فحیث وجدها فهوا حق بها

(درواہ الترمذی وابن ماجہ وقال الترمذی: ہذا حدیث غریب)

''کلمۂ حکمت عقل مند کی گم گشتہ چیز ہے، پس جس جگہ پائے وہی اس کا مستحق ہے۔''

یعنی حکمت اور دانائی کی باتوں کی ایسی مثال ہے جیسے کسی کی کوئی شے گم ہو جائے تو وہ اس کو جس کے پاس پاتا ہے لے لیتا ہے، اگر چہ وہ کیسا ہی ذلیل وحقیر آدمی ہو۔ وہ اس کے لینے میں اِس سے بھی عار نہیں کرتا کہ یہ ایک بھنگی کے ہاتھ میں ہے۔ اسی طرح عقل مند کو سمجھنا چاہیے کہ اچھی باتیں ہمارے مِلک ہیں، ان کے لینے میں کسی چھوٹے بڑے اور ذی عزت وحقیر کو نہ دیکھیں۔

پانچ واں باب
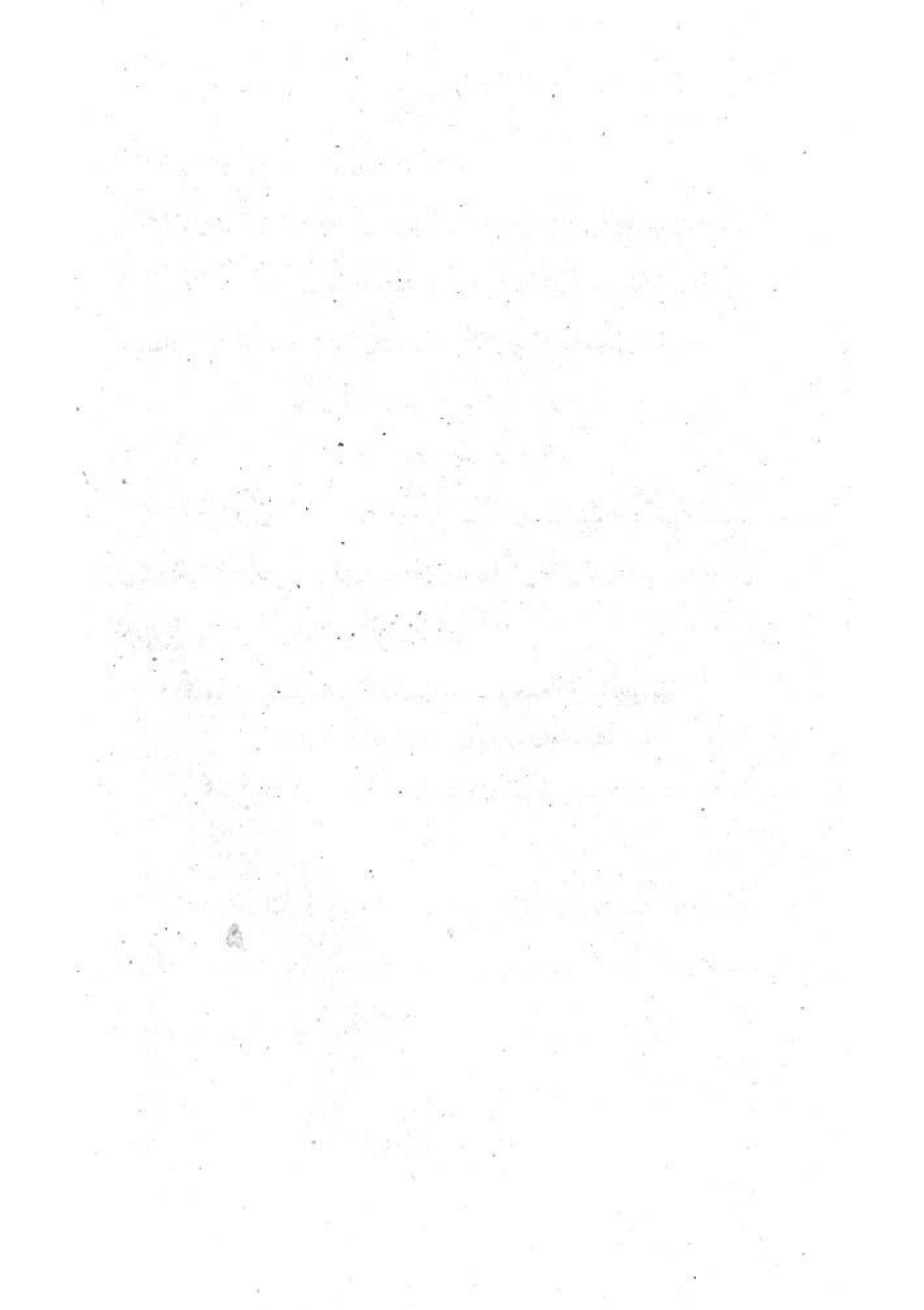
کم عمر سے علم حاصل کرنا باعث شرم نہیں

اس لیے بزرگان سلف نے اپنے چھوٹوں سے بھی علم حاصل کرنے میں کبھی شرم نہیں کی۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ آپ کو یہ علم و فضل کس طرح حاصل ہوا؟ فرمایا:

ما بخلت من الافادة وما استنكفت من الاستفاده

"میں نے کبھی لوگوں کو فایدہ پہنچانے میں بخل نہیں کیا اور خود حاصل کرنے میں شرم نہیں کی۔"

حضرت عمر فاروقؓ کا واقعہ:

بلکہ اکابر سلف تو باوجود خود بھی واقف ہونے کے اپنے چھوٹوں سے نصیحت اور وعظ کی درخواست کرتے تھے۔ کیوں کہ دوسروں کی زبان سے سننا قلب میں ایک خاص اثر اور تحریک پیدا کرتا ہے، جو اپنے علم سے کبھی حاصل نہیں ہوتی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسا حامل شریعت جو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا:

اللهم اعز الاسلام بعمر ابن الخطاب

''اے اللہ! اسلام کو عمر ابن الخطاب سے معزز فرما دے۔''

کا نتیجہ ہیں، جن کے متعلق آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

یا ابن الخطاب والذی نفسی بیدہ ما لقیك الشیطان سالکا فجا الا سلك غیر فجك.

''اے ابن خطاب! اس کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، جب شیطان تم کو کسی کوچے میں چلتے ہوئے دیکھ لیتا ہے (تو اس سے گزرنا چھوڑ دیتا ہے)، اور تمہارے کوچے کے سوا اور کسی کوچے سے گزرتا ہے۔''

حضرت کعب احبار رضی اللہ عنہ سے فرماتے ہیں:

یا کعب خوفنا (مستطرف: ج ۱، ص ۷۳)

''اے کعب! ہمیں (اللہ کے عذاب سے) ڈراؤ۔''

اسی لیے حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اعلم بالکتاب والسنۃ سمجھ کر جواب دیا:

الیس فیکم کتاب اللّٰہ وسنته نبیه صلی اللّٰہ علیه وسلم

''کیا تمہارے پاس قرآن وحدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں؟''

مگر حضرت امیر المؤمنین عمر رضی اللہ عنہ ہیں کہ فرماتے ہیں:

بلی یا کعب ولکن خوّفنا

''کیوں نہیں، مگر اے کعب! ہمیں عذاب سے ڈراؤ۔''

حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے نصیحت شروع کر دی اور فرمایا:

یا امیر المؤمنین اعمل فانك لو وفیت یوم القیمة بعمل

سبعین نبیاً لازدریت عملهم مما تری.

''اے امیر المؤمنین! عمل کرتے رہو، اس لیے کہ (عذاب آخرت ایسا شدید ہے) کہ اگر تم کو ستر انبیا کا عمل بھی دے دیا جائے تو تم اس کو بھی اس روز قہر کے سامنے ناکافی سمجھو گے۔''

یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سر جھکا کر بیٹھ گئے اور کچھ دیر تک اسی طرح بیٹھے رہنے کے بعد سر اُٹھایا اور فرمایا:

یا کعب خوّفنا

''اے کعب! ہمیں اور ڈرایئے۔''

حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

یا امیر المؤمنین لو فُتح من جهنم قدر منخر ثور بالمشرق ورجل بالمغرب لغلی دماغه حتی یسیل من حرّها.

''اے امیر المؤمنین! اگر جہنم میں سے بہ قدر بیل کی ناک کے سوراخ کے مشرق میں کھول دیا جائے اور ایک شخص مغرب میں ہو تو اُس کا دماغ کھولنے لگے، یہاں تک کہ اس کی گرمی سے بہہ جائے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سر جھکا لیا اور پھر جب ہوش میں آئے تو پھر فرمایا:

یا کعب زِدنا

''اے کعب! اور زیادہ کیجیے۔''

حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے پھر فرمایا:

یا امیر المؤمنین ان جهنم لتزفر زفرة یوم القیامة فلا یبقی

ملك مقرب ولا نبی مرسل الا جثی علی رکبیه.

''اے امیر المومنین! بے شک جہنم قیامت کے دن ایک ایسا سانس لے گی کہ کوئی مقرب فرشتہ اور نبی مرسل بھی باقی نہ رہے گا، (خوف سے) گھٹنوں کے بل نہ بیٹھ جائے۔''

کون کہہ سکتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو عذاب آخرت کی تہویل شان اور دوزخ کی شدت معلوم نہیں تھی، پھر حضرت کعب احبار رضی اللہ عنہ سے خوّفنا کی درخواست کرنا اگر اس حکمت پر مبنی نہ تھا کہ دوسرے سے سن لینا تاثیر فی القلب میں کوئی خاص اثر رکھتا ہے تو کیا وجہ تھی؟

حضرت جنیدؒ کا ایک درویش سے مکالمہ:

حضرت جنید بغدادی قدس اللہ سرہٗ سے اس بارے میں ایک عجیب واقعہ منقول ہے، فرماتے ہیں کہ میں حسب معمول ایک روز رات کو بہ نیت نماز اُٹھا، نماز شروع کی، مگر خلاف معمول نماز سے دل چسپی نہ ہوئی۔ انتشار طبیعت سے مجبور ہو کر لیٹ گیا اور سونے کا ارادہ کیا، مگر نیند نے بھی ساتھ نہ دیا۔ اب مجھ پر ایک عجیب حالت ہے، نہ تو عبادت ہی میں جی لگتا ہے اور نہ نیند ہی آتی ہے۔ آخر اس کش مکش سے مضطر (بے قرار) ہو کر یہ خیال آیا کہ چلو! کہیں باہر ہی ٹہلیں، شاید اس سے دل بہل جائے؟ گھر سے باہر نکل کر ایک سڑک پر ٹہلنے لگے۔ اچانک دور سے ایک شخص سر سے پیر تک چادر تانے ہوئے سرراہ لیٹا ہوا دکھائی دیا۔ حضرت جنیدؒ اس کی طرف چلے۔

شخص: (حضرت جنید کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھتے ہی چہرے سے چادر اُٹھا کر) یاسیدی الی الساعة؟ (مخدومی اتنی دیر؟)

حضرت جنیدؒ: یاسیدی من غیر موعد (مخدومی! بغیر میرے وعدے کے یہ شکایت کیسی؟)

شخص: میں بہت دیر سے ایک مسئلے میں متردد ہوں۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ یا اللہ! میرے لیے حضرت جنید کو بھیج دے۔

حضرت جنیدؒ: وہ مسئلہ کیا ہے؟

شخص: متی یصیر داء النفس دواھا؟ (نفس کی بیماری اس کی دوا کب بن جاتی ہے؟)

حضرت جنیدؒ: اذا خالفت النفس (جب نفس اپنی خواہشات کے خلاف کرنے لگے تو اس کی بیماری اس کے لیے دوا بن جاتی ہے)۔

شخص: اپنے نفس کی طرف متوجہ ہو کر، اسمعی قلت لك ھذا سبع مرات فابیت ان تسلمی الا ان تسمعی من جُنید (لے سن لے! یہی بات میں نے تجھ سے سات مرتبہ کہی، مگر تو بغیر حضرت جنید سے سننے کے اس کو تسلیم کرنے سے انکار ہی کرتا رہا)۔

حضرت جنیدؒ: یہ کیا؟

شخص: میں نے یہی بات جو آپ نے فرمائی اس کے جواب میں آپ کے آنے سے پہلے نفس سے کہی تھی، مگر اس کو اطمینان نہ ہوا، اب آپ کے فرمانے سے اطمینان ہو گیا۔ (طبقات الشافعیۃ الکبریٰ: ج۲، ص۲۹)

اب دیکھیے کہ ایک ہی جملہ ہے کہ اپنے ذہن میں مکرر آتا ہے مگر اطمینان نہیں ہوتا، اور دوسرے کی زبان سے سن کر شرح صدر ہو جاتا ہے، اس لیے اکابر سلف باوجود خود

واقف ہونے کے دوسروں کی نصیحت کے متمنی رہتے تھے، اگرچہ وہ ان سے علم وفضل یا عمر میں کم ہی کیوں نہ ہوں۔

قبول نصیحت، میٹھی یا کڑوی؟

حقیقت یہ ہے کہ قبول نصیحت ایک نہایت کڑوی چیز ہے۔ نفس اس سے بچنے کے لیے بہانے تلاش کرتا ہے۔ کبھی ناصح کی عملی برائیوں کو مکر کا جال بناتا ہے اور کبھی تاویلات کے درپے ہوتا ہے۔ بزرگوں نے کہا ہے:

ان جُرّةَ النصیحة مُرّة لا یقبلها الا الو العزم

''بے شک نصیحت کا گھونٹ کڑوا ہے، اس کو اہل ہمت کے سوا کوئی قبول نہیں کرسکتا۔''

مگر یہ بھی ظاہر ہے کہ حلاوت ابدی اسی ایک کڑوے گھونٹ میں منحصر ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں:

من اسود وجهه من النصحة اصفرّ لونه من الفضیحة

(شرح مسلم للنووی: ص ۵۱)

''جس کا چہرہ نصیحت سے (بہ وجہ غصے کے) سیاہ ہوجائے اس کا رنگ ایک دن رسوائی کی وجہ سے زرد ہوگا۔''

ہاں! جسے میدان قیامت میں اولین وآخرین کے سامنے رسوائی کا اندیشہ ہوا ہو اس کے سامنے آج نصیحت کی تلخی یقیناً قند وشکر کا کام دے گی۔ نصیحت سے ناک بھوں سمیٹنا فی الحقیقت سفاہت کی دلیل ہے۔ حضرت لقمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

الموعظة تشق علی السفیه کما یشق صعود الوعر علی

الشیخ الکبیر۔ (مستطرف: ج ا، ص ۷۳)

''نصیحت بے وقوف پر ایسی سخت ہوتی ہے جیسے کسی بڑے بوڑھے کے لیے سخت چیز پر چڑھنا۔''

اور حضرت علی کرم اللہ وجہ فرماتے ہیں:

لا تكونن ممن لا ينفعه الموعظة الا الهالف فی ایلامه فان العاقل تيعظ بالادب والبهائم لا تقط الا بالضرب

ولنعم ما قال الجاحظ:

وليس يزجركم ماتو عظون به

والبهم يزجرها الراعی فين زجر

''تم ان میں سے ہو جن کو نصیحت نفع نہیں دیتی جب تک کہ تم اُن کی ملامت میں مبالغہ اور تشدد نہ کرو، اس لیے کہ ذی عقل تو ادب ہی سے نصیحت پکڑ لیتا ہے اور بہایم بدوں (بلا) زدوکوب کے سیدھے نہیں ہوتے۔ جیسا کہ جاحظ نے کہا:

تمہیں مواعظ بھی سیدھے راستے پر نہیں چلاتے، اور بہایم کو چرواہا ہانکتا ہے تو وہ چلنے لگتے ہیں۔''

الحاصل یہ سب کید نفس اور تزویر شیطان ہے کہ بجائے ندامت اور قبول نصیحت کے ناصح کے عملی عیوب شمار کرنا شروع کر دے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

كفى بالمرء اثما ان يقال له اتق الله فيعضب ويقول

عليك نفسك. (مسطرف: ج ۱ ص ۱۷۲)

''انسان کو گناہ گار کرنے کے لیے یہی کافی ہے کہ جب اُس سے کہا جاے
کہ اللہ سے ڈر، تو غصہ ہو جاے اور کہے: تو اپنی خبر لے۔''

ہماری حالت :

اب شریعت کی اس پاکیزہ تعلیم کا اپنی حالت سے موازنہ کیا جاتا ہے تو زمین آسمان کا بُعد معلوم ہوتا ہے۔ نصیحت کی باتوں سے بے توجہی اور بے پروائی ہی نہیں بلکہ ہماری کوتاہ نظروں میں ناصح سے بڑھ کر ہمارا کوئی دشمن نہیں ہوتا۔ نفسانیت یہاں تک بڑھ گئی کہ اگر پہلے سے کسی معروف کے ارتکاب یا منکر سے اجتناب کا کچھ خیال بھی ہوتا ہے تو ناصح کے کہنے سے اور بھی جحود (جان بوجھ کر انکار کرنا) بڑھ جاتا ہے۔ ہمیں عار آتی ہے کہ کسی کے کہنے سے اپنے ارادے سے باز رہیں: ۔

ترک مے سے ہمیں انکار نہ ہوتا لیکن
اب جو ناصح کو ہے اصرار تو پینا ہے ضرور

اور اسی پر اکتفا نہیں، اس کے ساتھ ان کی توہین وتحقیر اور ان کے ساتھ تمسخر و استہزا بھی ہوتا ہے۔ ان کو مسجد کے مینڈھوں اور ملانوں کے کریہہ وشنیع الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے۔ حال آں کہ فتاویٰ عالمگیریہ میں تصریح ہے کہ اگر ایک شخص کسی کو امر بالمعروف کرے اور وہ اس کے جواب میں بہ طریق ردو انکار یہ کہے کہ کیوں شور کرتا ہے؟ تو خوف ہے کہ کہیں وہ کافر نہ ہو جاے، اور حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتی قدس سرہٗ تو اپنے رسالے ''کلمات الکفر'' میں فتاوی برہانی سے نقل کرتے ہیں کہ کافر شود۔ فنعوذ باللہ من مکائد الشیطان!

ہمارے اس تمام کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی کونصیحت سے کسی وقت اعراض جائز نہیں ہوسکتا، اگر چہ ناصح کیسا ہی بد کردار ہو۔ اسی طرح اپنی بدعملی کی وجہ سے کسی مسلمان کے ذمے سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ساقط نہیں ہوسکتا۔

اپنے فعل سے نصیحت کرو:

مگر یاد رہے کہ اس کی غرض ہرگز ہرگز یہ نہیں کہ اب مطلق العنان ہوکر خود تو جو چاہے کرتا رہے دوسروں کو وعظ و نصیحت کردیا کرے۔ بس یہ اس کی نجات کے لیے کافی ہے، کیوں کہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہے کہ اشد الناس عذاباً قیامت میں سب سے زیادہ عذاب کے اندر وہ عالم ہوں گے جو اپنے علم پر عمل نہیں کرتے۔ کیا ان کے دلوں کو ہلا دینے کے لیے:

كَبُرَ مَقْتاً عِنْدَاللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَالاَ تَفْعَلُوْنَ (سورۂ صف:۳)

"اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہایت بڑے غصے کی بات ہے کہ تم کہو وہ جو خود نہیں کرتے۔"

وعید شدید کافی نہیں؟ اور کیا وہ اس عذاب پر صبر کرسکتے ہیں جو قیامت میں ان کے لیے مقرر ہے؟

عن اسامة ابن زيد رضى الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم يجاء بالرجل يوم القيامة فيلقى فى النار فتندلق اقتابه فى النار فيطحن فيها كطحن الحمار برحاه فيجتمع اهل النار عليه فيقولون اى فلان ماشانك اليس كنت تامرنا بالمعروف تنهانا عن المنكر قال

کنت آمرکم بالمعروف ولا اتیه وانہا کم عن المنکر واٰتیہ۔ (رواہ الشیخان)

''حضرت اسامہ ابن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ بعض شخصوں کو قیامت میں لایا جائے گا اور آگ میں ڈال دیا جائے گا، پھر دفعتاً (پیٹ پھٹ کر) اس کی انتڑیاں آگ میں نکل پڑیں گی، اور وہ ان میں اس طرح گھومے گا جیسے گدھا اپنی چکی میں گھومتا ہے، پھر دوزخی اس کے پاس جمع ہوں گے اور کہیں گے کہ اے فلاں! تیرا کیا حال ہے؟ کیا تو ہمیں اچھے کاموں کا امر نہیں کرتا تھا اور بری باتوں سے منع نہیں کرتا تھا؟ وہ کہے گا کہ میں تمہیں تو معروف کا امر کرتا تھا اور خود نہیں کرتا تھا، اور تمہیں منکرات سے روکتا تھا اور خود کیا کرتا تھا۔''

نعوذ باللہ منہ!

اور حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے:

ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال رائیت لیلۃ اسری بی رجالاً تقرض شفاھھم بمقاریض من نار قلت من ھولاء یا جبرئیل قال ھولاء خطباء امتک یامرون الناس بالبر وینسون انفسھم۔ رواہ فی شرح السنتہ والبیھقی فی شعب الایمان. (مشکوٰۃ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے شب معراج میں چند آدمیوں کو دیکھا کہ ان کے ہونٹ آگ کی قینچیوں سے کاٹے جاتے تھے۔ میں نے کہا کہ اے جبرئیل! یہ کون لوگ ہیں؟ کہا کہ یہ آپ کی

امت کے واعظ ہیں، جو لوگوں کو نیکی کا حکم کرتے تھے اور اپنے آپ کو
بھلائے رہتے تھے (یعنی خود عمل نہ کرتے تھے)۔"

علاوہ بریں جب خود عمل نہیں ہوتا تو ان کا یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی بے کار ہوتا ہے، کیوں کہ سامعین پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا، اور ان کے طویل وعریض وعظ ونصائح کی حقیقت:

جعجعة ولا طحين

"چکی کی آواز تو ہے مگر آٹا نہیں۔"

کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔ اس لیے بزرگوں نے کہا ہے:

عظ الناس بفعلك ولا تعظهم بقولك

"لوگوں کو اپنے فعل سے نصیحت کرنہ کہ (فقط) قول سے۔"

صحابہؓ کی صورتوں کو دیکھ کر اسلام قبول کر لیا جاتا تھا:

واقعی اگر انسان خود عامل ہوتا ہے تو وعظ ونصیحت کی بھی چنداں ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کی صورت اس کی ہر حرکت ایک مؤثر وعظ ہوتا ہے۔ اسی لیے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین چوں کہ ان خصال واخلاق کے جو آج ہماری زبان سے تجاوز نہیں کرتے، عملی تصاویر تھے۔ ان میں سے ایک ایک کا وجود اسلام کی حقانیت کی روشن دلیل تھا۔ ان کی ایک مرتبہ کی زیارت وہ اثر رکھتی تھی کہ آج بڑے بڑے علما کے ہزاروں طویل وعریض وعظ وتقریر ان سے کچھ بھی نسبت نہیں رکھتیں۔ بہ کثرت ایسے واقعات پیش آتے ہیں کہ لوگ صحابہؓ کی صورتوں کو دیکھ کر ہی مشرف بہ اسلام ہوئے، اور اسی لیے چوں کہ سابقین قول وفعل میں نسبت مساوات بلکہ کسی قدر عمل راجح رکھتے

تھے، ان کے مواعظ چند سیدھے سادے مختصر جملوں سے تجاوز نہیں کرتے تھے، مگر یہی جملے کچھ ایسے بارعب ہوتے تھے کہ بڑے بڑے متکبر سلاطین وامرا کے سر جھکا دینا ان کا ادنا کام تھا۔

فرعون کو تبلیغ:

دیکھو! حضرت موسیٰ علیہ السلام جو ظاہر میں نہ کوئی سلطنت رکھتے ہیں اور نہ جاہ و جلال، نہ خدم وحشم ان کے ساتھ ہے، اور نہ کچھ لشکر وسپاہ، بہ ایں بے سروسامانی تن تنہا اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو ساتھ لے کر فرعون جیسے سرکش بادشاہ کے دربار میں جاتے ہیں، جس کو خداوند عالم خود فرماتے ہیں:

اِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِی الْاَرْضِ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِیْنَ ○

(سورۂ یونس: ۸۳)

''البتہ فرعون بڑا ہے زمین میں، اور البتہ وہ فاسقین میں سے ہے۔''

اور چند سادے مگر نہایت آزادانہ جملوں کے سوا کچھ نہیں فرماتے۔ فرماتے ہیں:

اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ○

(سورۂ طٰہٰ: ۴۷)

''ہم تیرے رب کے ایلچی ہیں، پس تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے اور ان کو تکلیف نہ دے۔''

فرعون کے دربار کو دیکھیے اور اس آزادی تقریر کو ملاحظہ فرمایئے کہ اس کے ساتھ یہ بھی فرماتے ہیں کہ تو میرا کچھ نہیں کرسکتا۔ کما قال تعالیٰ:

اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ (سورۂ دخان: ۲۰)

"البتہ میں اپنے اور تمہارے رب سے اس کی پناہ لے چکا ہوں کہ تم مجھے سنگ سار کردو۔"

جسے سن کر ایک گھٹنوں کے بل چلنے والے بچے کو بھی طیش آجائے، اور اس سے زیادہ عجیب یہ ہے کہ فرماتے ہیں:

اِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِیْ فَاعْتَزِلُوْنَ ۝ (سورۂ دخان:۲۱)

"اگر تم مجھ پر ایمان نہیں لاتے تو مجھ سے دور ہو جاؤ۔"

سبحان اللہ! اسی کے دربار میں اسی کو فرماتے ہیں کہ اگر ایمان نہیں لاتا تو دور ہو جا اور مجھے منہ نہ دکھلا۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کسی ظاہری کمک اور قوت کے اعتماد پر یہ تیز کلامی فرما رہے تھے یا ان کے ساتھ کوئی ایسی ظاہری طاقت تھی جو فرعون کے جرار لشکر کا مقابلہ کر سکے؟ نہیں اور ہرگز نہیں۔

مگر ہاں! چوں کہ جس امر کی طرف وہ فرعون کو بلانا چاہتے تھے خود بھی سر سے پیر تک اس کی عملی تصویر بن چکے تھے:

اِنَّنِیْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰی (سورۂ طٰہٰ:۴۶)

"میں تمہارے ساتھ ہوں، سنتا اور دیکھتا ہوں۔"

کی وہ زبردست طاقت ان کے ساتھ ہو گئی تھی کہ تمام دنیا کی مجموعی طاقتیں اس کے مقابلے میں پر پشہ (مچھر کے پر) کے برابر بھی حقیقت نہیں رکھتیں۔ اسی خداداد قوت و ہمت کا کرشمہ ہے کہ ان دو جملوں نے فرعون پر وہ کام کیا جو ایک بڑے لشکر جرار سے ناممکن تھا۔ فرعون گھبرا اٹھا اور کہا:

اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ (سورۂ طٰہٰ:۶۳)

''یہ دونوں بے شک جادوگر ہیں۔ ارادہ کرتے ہیں کہ تمہیں تمہارے ملک سے نکال دیں۔''

دو بھائیوں کی بے سروسامانی اور بادشاہ کا تأثر:

ان دو بھائیوں کی بے سروسامانی ملاحظہ فرمایئے کہ لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں، اور فرعون کے اس خوف کو دیکھیے کہ کہہ رہا ہے کہ یہ دونوں بھائی تو مجھے ملک سے نکالنے آئے ہیں۔ بھلا کوئی آدمی جس کے دماغ میں عقل ہو کہہ سکتا ہے کہ اتنا بڑا بادشاہ ان دو غریب شخصوں سے ڈر رہا تھا؟ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا ہے کہ وہ ان کو جادوگر سمجھ کر ان کے سحر سے متاثر تھا، جیسا کہ بہ ظاہر الفاظ قرآن سے معلوم ہوتا ہے، کہ کیوں کہ اگر یہ دو ساحر تھے (العیاذ باللہ) تو اُس کے ملک میں ہزاروں کی تعداد میں ساحر موجود تھے، پھر اس خوف کی وجہ؟ فی الحقیقت تاثیر فی القلب اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ جس توحید کی طرف فرعون کو بلانا چاہتے تھے خود بھی اس میں سر سے پیر تک ڈوبے ہوئے تھے۔

یہ حال حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہے۔ اب دیکھ لیجیے کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کا کیا اثر ہوگا: ع

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

حضور علیہ السلام کی تقریر کی کیفیت:

صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم فرماتے ہیں کہ جس وقت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ ابی واُمی) تقریر فرماتے تھے تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ واقعہ ہماری آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔ دوزخ و جنت یا احوالِ قیامت گویا ان کے سامنے متمثل ہو جاتے تھے۔

چناں چہ (امام) ترمذیؒ حضرت نوآس ابن سمعان کلابی رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث میں روایت کرتے ہیں:

قال ذكر رسول الله صلى الله عليه وسلم الدجال ذات غداة فخفض فيه ورفع حتى ظنناه في طائفة النخل فانصرفنا من عند رسول الله صلى الله عليه وسلم ثم رُحنا اليه فعرف ذالك فينا فقال ما شانكم قال قلنا يارسول الله ذكرت الدجال فخفضت ورفعت حتى ظنناه في طائفة النخل. (الحديث)

''حضرت نوآس ابن سمعان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز بہ وقت صبح دجال کا ذکر کیا اور (کبھی) اس کی حقارت بیان کی (کہ مثلاً وہ بھینگا ہے، اور کبھی اس کی بڑائی بیان کی کہ بہ اذن خداوندی وہ احیاے اموات کر سکے گا وغیرہ)۔ یہاں تک کہ ہمیں ایسا خیال ہوگیا کہ دجال گویا کھجور کے درختوں میں ہے۔ پھر ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے لوٹ آے۔ پھر شام کے وقت ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہوے تو آپ نے ہمارے چہروں میں اس کا خوف دیکھا اور فرمایا کہ تمہارا کیا حال ہے؟ راوی کہتے ہیں کہ ہم نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! آپ نے دجال کا ذکر کیا اور اس کی تحقیر و تہویل بیان کی، یہاں تک کہ ہمیں ایسا خیال بندھ گیا کہ گویا وہ کھجور کے درختوں میں ہے۔''

یہ انبیا علیہم السلام کے حالات ہیں۔ اب اسی منوال (طرز) پر صحابہؓ و اولیا اور علما

ہیں۔ جتنا کسی کا قدم عمل میں راسخ ہوا اتنا ہی اس کا کلام مؤثر اور اس کی تقریر نافع ثابت ہوئی۔

اور آج جب کہ نوبت ہم جیسے بدنام کنندہ نکونامے چند پر پہنچی، جن کی تقریریں ان کے حالات سے مباین، جن کا ظاہر باطن کی صریح نقیض:۔

از بروں طعنہ زنے بربا یزید
وزدر ونت ننگ میدارد یزید

تو اثر کا اثر تک باقی نہ رہا۔ الا ماشاء اللہ تعالیٰ!

مسلمان کا کام:

لیکن بہ ایں ہمہ مسلمان مامور ہے کہ کسی وقت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ترک نہ کرے، کہ شاید کوئی صالح قلب متاثر ہو اور یہی ذریعۂ نجات بن جائے۔ قال تعالیٰ:

فَاِنَّ الذِّکْرٰی تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِیْنَ۝ (سورۂ ذاریات:۵۵)

''البتہ نصیحت مومنین کو نفع دیتی ہے۔''

اور حضرت محمد ابن تمامؒ فرماتے ہیں:

ان الموعظة جند من جنود اللّٰہ تعالیٰ و مثلها مثل الطین یضرب به علی الحائط ان استمسك نفع وان وقع اثر.

(مستطرف: ج ا،ص ۴۳)

''البتہ نصیحت ایک لشکر ہے اللہ تعالیٰ کے لشکروں میں سے، اور اس کی مثال اس گارے کی سی ہے جس کو دیوار پر مارا جائے (کہ) اگر ٹھہر جاتا ہے تو دیوار کو نفع (استحکام) دیتا ہے اور اگر گر بھی پڑتا ہے تو اثر (ضرور) رہ

جاتا ہے۔"

بالجملہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر شخص پر ہر حال میں فرض ہے، اگرچہ وہ خود بھی اُن اُمور میں کوتاہیاں کرتا ہو، البتہ فرض کفایہ ہے۔ اگر کسی ایک شخص نے بھی ادا کر دیا تو سب کے ذمے سے ادا ہو جائے گا، ورنہ جس جس نے اُس کو دیکھا ہے اور باوجود قدرت کے پھر اس کو منع نہ کیا تو سب کے سب ماخوذ ہوں گے۔ جیسا کہ نماز جنازہ چند آدمی کا ادا کرنا کافی ہوتا ہے، اور درصورت ترک سب کے سب گناہ گار ہوتے ہیں۔

چھٹا باب

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے لیے شرط

ہاں! اس کی فرضیت کے لیے شرط صرف یہ ہے کہ یہ شخص اس معروف کے معروف ہونے اور منکر کے منکر ہونے سے واقف ہو۔ اصطلاحی عالم ہونا ضرور نہیں، بلکہ عام مسلمان بھی اس کے مکلّف ہیں۔

امر بالمعروف فرض کب ہوتا ہے؟

الغرض جو شخص کسی مسلمان بھائی کو ایسے کام میں مبتلا پائے جس کے منکر شرعی ہونے کا اس کو علم ہے، تو فرض ہے کہ نہی عن المنکر سے باز نہ رہے، اور یہ علم بہ اختلاف اشیا مختلف ہوتا رہتا ہے، کیوں کہ بعض امور تو وہ ہیں جو ضروریات دین میں سے ہیں، جن کو ہر شخص جانتا ہے، جن سے کسی مسلمان کا ناواقف ہونا ممکن نہیں۔ مثلاً: نماز، روزہ، حج، زکوۃ وغیرہ ہر شخص جانتا ہے کہ مسلمان کے ذمے یہ چیزیں فرض ہیں اور ان کا تارک سخت گناہ گار ہے، تو ان کو ترک ہوتے ہوئے دیکھ کر جیسا کہ ایک عالم کا فرض ہے کہ اُس کو راہ راست پر لانے میں اپنی امکانی کوشش صرف کرے ایسے ہی ایک عاصی (گناہ گار) مسلمان بھی اس کا مکلّف ہے، اس کے لیے بھی جایز نہیں کہ

نہ قاضیم نہ مدرس نہ محتسب نہ فقیہ
مراچہ سود کہ منع شراب خوارہ کنم

کہہ کر بری ہو جائے، بلکہ اس قسم کا کلام بڑے خوف کی جگہ ہے، کیوں کہ عالمگیری میں جزئیہ مصرّح (تفصیل سے) ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو کہے کہ چل فلاں شخص کو امر بالمعروف یا نہی عن المنکر کریں اور وہ شخص اس کے جواب میں یہ کہے کہ اُس نے میرا کیا بگاڑا ہے، میں کیوں اُس کو امر بالمعروف کروں؟ تو یہ شخص کافر ہو جائے گا۔ البتہ بعض وہ منکرات ہیں جن کو علما ہی سمجھ سکتے ہیں۔ سو اُن میں عوام کو تکلیف بھی نہیں دی گئی کہ وہ اُن کے مٹانے کی کوشش کریں، مگر غضب تو یہ ہے کہ عوام نے اپنے کو اس فرض سے بالکل بری الذمہ سمجھ لیا ہے۔ ان کے سامنے کھلم کھلا منکرات ہوتے رہیں، صریح محرمات کا ارتکاب اور قطعی فرایض کا ترک ہوا کرے ان کی بلا سے۔ انہوں نے اپنی نجات کے لیے اس کو کافی خیال کر رکھا ہے کہ خود دو چار ٹکریں سجدے میں مار لیا کریں اور بس، پھر ان کی طرف سے دنیا میں کچھ ہوا کرے۔ صرف ان کے سامنے ہی نہیں بلکہ ان کے گھروں میں منکرات ومحرمات شایع ہوں، فرایض وواجبات متروک ہو جائیں، شعائرِ دین پامال ہوا ہوس (حرص ولالچ) کیے جائیں، حدود اللہ سے تعدی ہوا کرے، رسوم بدعیہ وشرکیہ کو دین سمجھ لیا جائے، انہیں اصلاً پرواہ نہیں ہوتی۔ انہوں نے ان سب چیزوں کا جواب دہ صرف بے چارے علما ہی کو بنا رکھا ہے[۱]۔ حال آں کہ فقہانے تصریح کی ہے کہ امر بالمعروف اگر چہ فی نفسہ فرض کفایہ ہے مگر واجب ہر شخص پر ہے، اور بعض کے کرنے سے سب بری الذمہ ہو جاتے ہیں، مگر بعض اوقات کوئی خاص شخص بھی اس کے لیے متعین ہو جاتا ہے۔ پھر اس کی جواب دہی صرف اُسی

---

(۱) غور فرمایئے! کیا آج دعوت وتبلیغ سے متعلق اکثر افراد، یا دین کے دعوے دار اس میں مبتلا نہیں ہیں؟ حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ کے ان الفاظ کو ہم بار بار مطالعہ کریں اور اپنی اصلاح کریں۔ (شریفی)

کے ذمے ہوتی ہے، اور وہ صورت امر بالمعروف اس کے سوا کسی سے مواخذہ نہیں۔

امر بالمعروف فرض کفایہ کب ہوتا ہے؟

مثلاً جب کہ اس کا مرتکب ایسا شخص ہے جس پر اس کے سوا کسی کو یا اطلاع نہیں ہوسکتی اور یا باوجود اطلاع منع کرنے کی قدرت نہیں۔ جیسے اس کی زوجہ اور اولاد وغیرہم۔ چناں چہ مُلا علی قاریؒ مرقات میں فرماتے ہیں:

وهو فرض كفاية ومن تمكن منه وتركه بلا عذر أثم و قد يتعين كما اذا كان في موضع لا يعلم به الا هو ولا يتمكن من النالته الا هو كمن يرى زوجه او ولده او غلامه على منكر.

''امر بالمعروف فرض کفایہ ہے، اور جو شخص کہ اس کی قدرت رکھے اور پھر بلا عذر اس کو ترک کرے تو گناہ گار ہوگا، اور کبھی متعین بھی ہو جاتا ہے، جیسے جب کہ ایسی جگہ ہو کہ اس کے سوا اُس سے کوئی واقف نہ ہو اور اس کے ازالے پر اس کے سوا کوئی قادر نہ ہو۔ جیسے کوئی اپنی زوجہ یا اپنے لڑکے یا اپنے غلام کو کسی منکر میں مبتلا پاوے۔''

اس لیے ہر شخص پر جیسا کہ خود منکرات اور معاصی سے اجتناب لازم اور ضروری ہے اسی طرح فرض عین ہے کہ اگر اپنی اولاد یا زوجہ یا ایسے دوست احباب کو جو اس کی ناراضی کا تحمل نہ کرسکیں، کسی منکر یا معصیت میں مبتلا پائیں تو اس کے تغیر اور محو کی کوشش کریں۔ ابتداً زبانی فہمایش اور خلق و ملاطفت سے سمجھائیں۔ اگر یہ کارگر نہ ہو تو کسی قدر سختی اور تخویف (ڈرانے) سے کام لیں۔ اسی طرح حکمت اور دور بینی سے جس گرہ

کو انگلیاں کھول سکتی ہیں اس میں دانتوں کی نوبت نہ آنے دیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دس نصیحتیں

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی ایک طویل حدیث میں ہے، جس میں انہوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ دس نصیحتیں جو درحقیقت انسان کے لیے فلاح دارین وتحصیل مراتب عالیہ کے لیے ایک عجیب دستورالعمل ہے، بیان کی ہیں۔ یہاں پر ہماری غرض اگرچہ اُس کی آخری جملوں سے متعلق ہے، مگر بہ وجہ مذکور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث بتمام نقل کردی جائے۔ وھو ھذا:

اوصانی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بعشر کلمات قال لا تشرك باللّٰہ شیئا وان قتلت وحرقت ولا تعقن والدیك وان امراك ان تخرج من اھلك وما لك ولا تترکن صلاۃ مکتوبۃ متعمداً فان من ترك صلاۃ مکتوبۃ متعمداً فقد برئت منہ ذمۃ اللّٰہ ولا تشربن خمراً فانہ رأس کل فاحشۃ وایاك والمعصیۃ فان بالمعصیۃ حل سخط اللّٰہ وایاك والفرار من الزحف وان ھلك الناس واذا اصاب الناس موت و انت فیھم فاثبت و انفق علی من عیالك ولا ترفع عنھم عصاك ادباً واخفھم فی اللّٰہ.

(رواہ احمد)

''حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دس چیزوں کی وصیت فرمائی ہے۔ ۱: فرمایا کہ شرک مت کر، اگرچہ تو قتل کیا جائے یا جلادیا جائے۔ ۲: اور اپنے

والدین کی نافرمانی مت کر، اگرچہ وہ تجھے اس کا حکم کریں کہ تو اپنی بیوی اور اپنے مال کو چھوڑ دے۔ ۳: اور نماز فرض کو عمداً ہرگز نہ چھوڑ، اس لیے کہ جو شخص فرض نماز کو عمداً ترک کرتا ہے اُس سے اللہ تعالیٰ کا عہد حفاظت بری ہو جاتا ہے۔ ۴: اور شراب نہ پی، اس لیے کہ تمام بے شری کی جڑ یہی ہے۔ ۵: اور گناہ سے بچو، اس لیے کہ گناہ ہی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا غصہ نازل ہوتا ہے۔ ۶: اور جہاد میں سے بھاگ جانے سے بچو، اگرچہ تمہارے لوگ ہلاک اور مغلوب ہی کیوں نہ ہوں۔ ۷: اور جب لوگوں کو موت عام (مثل وبا طاعون وغیرہ کے) پہنچے اور تم اُن میں موجود ہو تو وہیں ثابت قدم رہو (بھاگو نہیں)۔ ۸: اور اپنے اہل وعیال پر اپنی قدرت کے موافق خرچ کرو۔ ۹: اور ادب سکھانے کے لیے ان کے سر سے اپنی لاٹھی نہ اُٹھالو (بلکہ ان کی رجز و تنبیہ سے غافل نہ ہو)۔ ۱۰: اور ان کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈراو۔"

ہر شخص کو اپنے اعمال کا محاسبہ کرنا ضروری ہے:

اب وہ شخص جو یقین رکھتا ہے کہ قیامت قایم ہوگی، ہر صغیر و کبیر (چھوٹے بڑے) کے اعمال کا حساب لیا جائے گا، قہر خداوندی سے انبیا علیہم السلام تک تھرا رہے ہوں گے، اُس کو جس طرح کہ اپنے اعمال کی اصلاح ضروری ہے اسی طرح اپنی زوجہ و اولاد کی اصلاح بھی فرض ہے۔ کیوں کہ اُس پر جیسے اپنے اعمال کا محاسبہ ہے اسی طرح اپنے متعلقین کے اعمال کی جواب دہی بھی ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال الا کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ فالامیر الذی علی الناس راع علیھم وھو مسئول عنھم والرجل راع علی اھل بیتہ وھو مسئول عنھم المرئۃ راعیۃ علی بیت بعلھا وولدہ وھی مسئولہ عنھم والعبد راع علی مال سیدہ وھو مسئول عنہ فکلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ۔

(ابوداؤد: ج ۲، ص ۵۰)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ خبردار! تم سب (کسی نہ کسی کے) راعی اور نگہبان ہو، اور تم سب سے اپنی اپنی رعیت کے متعلق سوال کیا جائے گا، پس وہ بادشاہ جو لوگوں پر حکم راں ہے وہ اُن کا نگہبان ہے اور اُس سے اُن سب کے متعلق سوال ہوگا، اور مرد نگہبان ہے اپنے اہل بیت پر، اور اُس سے ان کے متعلق بازپرس ہوگی، اور عورت اپنے خاوند کے گھر اور بچوں کی نگہبان ہے، اُس سے اُس کا سوال ہوگا، اور غلام اپنے آقا کے مال کا نگہبان ہے اور اُس سے اُس کا سوال ہوگا۔ الغرض تم میں سے ہر شخص نگہبان ہے اور ہر شخص سے اپنی اپنی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا۔''

اور پھر چوں کہ زوجہ اور اولاد پر اس کو زبانی فہمائش کے سوا تنبیہ و تہدید کا بھی حق حاصل ہے، اس لیے محض فہمائش سے بھی بری نہیں ہوسکتا، اور یہ محض تزویر نفس اور تلبیس ابلیس ہے، جو لوگ کہا کرتے ہیں کہ بھائی! ہمارا کام سمجھانا تھا، سو کر چکے، اب وہ جانے اور اُس کا عمل، اور پھر ہنسی خوشی محبت و پیار سے اُس کے ساتھ اختلاط جاری

رکھتے ہیں۔ اس کا منشا حقیقت میں دین سے بے توجہی اور شریعت کے ساتھ عدم مبالات ہے۔ اس کا امتحان جب ہوسکتا ہے کہ آپ کی اولاد یا زوجہ کسی کام میں آپ کے خلاف طبع عمل کریں، ہم تو جب جانیں کہ آپ اُس وقت ایک دو مرتبہ صرف زبانی فہمایش کر کے چپ ہو بیٹھیں اور وہ اُسی اپنی من مانی بات پر جمے رہیں۔

ہماری کیفیت:

اب اپنے قلب کو ٹٹول کر دیکھیے اور انصاف کیجیے کہ کیا آپ اپنے ایسے متعلقین سے اِس قسم کی خلاف طبع حرکتیں دیکھ کر زبانی فہمایش کے بعد اُن کی بدعنوانیوں اور نافرمانیوں پر صبر وسکوت کے ساتھ اُن سے وہی اختلاط ومحبت کا معاملہ جاری رکھ سکتے ہیں؟ نہیں اور یقیناً نہیں، بلکہ عمر بھر کا وہ علاقۂ محبت جو عروق شجر کی طرح قلوب میں راسخ ہو اور جس کی وجہ سے اُس کو اپنے نفس پر مشاق ومصایب کا تحمل بہ نسبت اپنی اولاد وزوجہ کے تعب وشدائد کے نہایت آسان معلوم ہوتا ہے، اُس کو ایک ہی ناشایستہ حرکت اور نافرمانی کی وجہ سے غیظ وغضب کی بھڑکتی ہوئی آگ کی نذر کر دیتے، اور طبعاً متنفر ہو کر متارک اور مفارقت پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ تلخ کلامی سے گزر کر حرب و ضرب تک ہوتی ہے۔ اولاد سے قطع رحمی اور ازواج پر طلاق کی نوبت آتی ہے۔

کیوں صاحب! اگر آپ کے اختیار میں سوائے زبانی فہمایش کے کچھ نہ تھا تو ایک ذرا سی خلاف حرکت پر اتنا طیش کیوں آیا؟ اور جو کچھ آپ کے اختیار میں نہ تھا کیوں کر گزرے؟

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے قلوب میں دین اور اُس کے شعائر کی اتنی بھی وقعت نہیں جتنی کہ اپنی خواہشات اور ہوائے نفسانی کی۔ ورنہ جس طرح کہ اپنی خواہشات

کے خلاف پر ہمیں غصہ آتا ہے، طبیعت اُس کے مخالف کے ساتھ اختلاط اور مجالست سے متنفر ہو جاتی ہے، اُس سے زیادہ خلاف شرع دیکھنے سے ہونی چاہیے۔

اللہ سے جتنی محبت، اتنا نوازا گیا:

اور اسی لیے سلف صالحین جن کے قلوب اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور ان کے شرائع کی عظمت و وقعت پر مجبول تھی، ان کے حق میں نظریں خلاف طبع اور ناگوار باتوں پر صبر و تحمل کرنے کو اس سے زیادہ اسہل واہونی سمجھتی تھیں کہ کوئی امر مرضیٔ خدا اور رسول کے خلاف دیکھیں۔ شریعت چوں کہ ان کی عادت بن گئی تھی، ان کو اُس کے خلاف پر ایسے ہی صبر نہ ہو سکتا تھا جیسے ہم سے اپنی عادت کے خلاف پر نہیں ہوتا۔ کیوں کہ

الصبر یحمد فی المواضع کلها

الا علیك فانه مذموم

''صبر ہر جگہ محمود و مطلوب ہے، مگر (اے اللہ) تیرے چھوڑنے پر صبر تو مذموم و مکروہ ہی ہے۔''

اسی وجہ سے علما و صلحا سے لے کر اولیا اور صحابہ رضی اللہ عنہم تک کو دیکھا جاتا ہے کہ جتنی کسی کو حب فی اللہ نصیب ہوئی، تدین و تقوے سے حصہ ملا، اتنا ہی احکام شرعیہ وغیرہا میں اختلاف بڑھا۔ اُن کی حق پرست نگاہیں اپنے خیال میں جس چیز کو جادۂ سنت سے ایک انچ مائل پاتی تھیں اس کے انکار اور رد کے درپے ہو جاتی تھیں۔ یہاں سے یہ بھی منکشف ہو گیا کہ سلف صالح کا مسائل میں باہمی اختلاف اور بہ کثرت نزاع صحابہ کے باہمی مشاجرات یہاں تک کہ بعض مرتبہ تیز کلامی کی نوبت آجاتی۔ ایک

سے دوسرے کی نسبت طعن آمیز الفاظ کا نکلنا سب عین حق پرستی اور تدین ہے، جیسا کہ اصحاب مذاہب اربعہ حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ، حنبلیہ میں بہ کثرت پیش آیا ہے کہ برابر آپس میں تعریضات اور تشنیعات جاری رہیں، بلکہ خود ائمہ سے بھی اس قسم کی بعض باتوں کا ثبوت ملتا ہے۔

تم اُڑ جاؤ گے:

جیسا کہ امامنا الاعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ انہوں نے حضرت عبداللہ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کو قبل رکوع اور بعد رکوع رفع یدین (ہاتھوں کا کانوں تک اس طرح اُٹھانا جیسے ابتدا میں اُٹھاتے ہیں) کرتے ہوئے پایا تو فرمایا:

انك تطير

''تم اُڑ جاؤ گے (کیوں کہ پرندوں کی طرح بازو ہلاتے ہو)۔''

اختلاف رحمت کیوں ہے؟

اسی طرح امام بخاریؒ کی بعض تعریضات مذہب امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ پر مشہور و معروف ہیں۔ حق یہ ہے کہ سب حق پرستی اور اتباع سنت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر مبنی ہے۔ حضرات محدثین کے مشاجرات اور اختلافات اگر متوسطین پر پیش کیے جائیں تو شاید اُن کو تعجب و حیرت ہو اور خلجان پیدا ہو جائے، مگر درحقیقت عقل و دین کا مقتضی ہی یہ تھا کہ مسایل میں اختلاف ہو، آپس میں نزاع ہو، بلکہ جتنا زیادہ اتباع سنت کا کسی کو خیال ہو اُتنا ہی زیادہ احکام شرعیہ میں اختلاف ہو، کیوں کہ سب کا ہر مسئلے میں متفق الرائے ہونا تو ناممکن ہے، اور درصورت خلاف اُن سے یہ ممکن نہیں

ہوسکتا کہ وہ اس کو رد نہ کریں یا اپنے مسلک کی ترجیح کے درپے نہ ہوں، اور جب دین ہی ناقص ہو تو پھر اس کو کیا غرض ہے کہ دوسروں پر رد و انکار کرے؟

تحریک آزادی کی بحث:

جس آفت میں آج ہم مبتلا ہیں اور خصوصاً ہمارے وہ بھائی جو اپنے کو قوم کا لیڈر کہتے ہیں، جن کی زبانوں پر اتفاق اتفاق کے الفاظ جاری ہیں، اگرچہ حلق کے نیچے اُس کا کچھ اثر نہیں، وہ صلح کل کے طالب جن کا مبلغ سعی ہے کہ ہندو اور مسلمان کو ملا کر اجتماع ضدین کا تماشہ دکھادیں، جنہیں اپنے خیال خام:

منظور صلح کُل ہے تو پھر گُل کو دیکھنا
یہ کیا کہ بچنا خار سے اور گُل کو دیکھنا

کے سامنے ارشاد خداوندی:

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِىْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَالَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ (سورۃ بقرۃ:۱۲۰)

''اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! یہود و نصاریٰ تم سے ہرگز رضامند نہ ہوں گے، یہاں تک کہ تم اُن کی ملت کا اتباع کرو۔ تم اُن سے کہہ دو کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت یہی ہے، اور اگر تم اُن کی خواہشات کی پیروی کروگے بعد اس کے کہ تم کو علم حاصل ہو جاتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کے مواخذے سے کوئی تم کو بچانے والا نہیں ہے۔''

کی بھی پرواہ نہیں ہوتی، جن کی رائے: ع

با مسلمان اللہ اللہ و با برہمن رام رام

جس کا خلاصہ مذہب سے ہاتھ دھو لینا ہے۔ جس کی اجازت قانون شریعت کسی وقت نہیں دے سکتا۔ اسلام نے اگر صلح کل کی تعلیم دی ہے اور اگر کفار بلکہ ہر جان دار کے ساتھ حسن معاشرت اور خوبی معاملے کا سبق پڑھایا ہے تو اُس کے درجات مقرر کیے ہیں کہ کفار کے ساتھ حسن معاشرت کہاں تک جائز ہے؟ اور مسلمان بھائی کے ساتھ کہاں تک؟ شریعت نے ایک مسلم مبتلائے منکرات کے ساتھ اختلاط سے منع کیا ہے تو کفار کے ساتھ بلا کسی مصلحت شرعیہ کہاں اجازت دے گی؟

درحقیقت ایسی صلح کل کی طلب اسی کا کام ہے جس کو مذہب سے سروکار نہیں، اور مُداہن فی الدین کے سوا کسی کو ہر صلح کل حاصل بھی نہیں ہو سکتی۔ چناں چہ حضرت سفیان رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے:

اذا رأیت رجلا ممدو حاً فی القران و محبوباً فی الا خوان فا علم انہ مداھن۔ (روح البیان)

”جب تم کسی شخص کو سب ہم عصروں اور تمام دوستوں میں (زیادہ) محبوب اور ممدوح دیکھو تو سمجھ لو کہ وہ مداہن (دین میں سستی کرنے والا) ہے۔“

ہم تو جب جانیں کہ انہیں اُن سے کوئی ذاتی مخاصمت اور اپنے کسی حق میں نزاع پیدا ہو جائے اور پھر صلح کل کے طالب رہیں، اپنے حق سے دست بردار ہو جائیں۔ یہ صلح کل کا نزلہ تو دین ہی کے عضوِ ضعیف پر گرتا ہے۔

مسلمان آپس میں بھائی ہیں لیکن

اور اکابر سلف کا عضو ضعیف چوں کہ معیشت دنیاوی تھی، اس میں وہ اتنا ایثار اور اغماض وتسامح سے کام لیتے تھے کہ اس قسم کے منازعات کا عدو اسلام کی تاریخ میں منازعات دینیہ کے مقابلے میں کوئی نسبت نہیں رکھتا۔ یہ لوگ بہ آں کہ ’’مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔‘‘ المسلم اخ المسلم کے ٹھیک مظہر، اتحاد و یگانگی، اتفاق ومحبت کے عجیب بے نظیر دنیاوی امور میں اغماض وتسامح کرنے میں بھی اپنی نظیر آپ ہی تھے۔ ایک اجنبی آدمی ان کے معاملات اور معاشرت کو دیکھ کر بہ مشکل تمیز کرسکتا تھا کہ یہ آپس میں حقیقی بھائی نہیں، لیکن شریعت وسنت کے مقابلے میں حقیقی بھائی یا عزیز واقربا کا تو کیا ذکر، والدین اور اولاد سے متارکت ومفارقت پر آمادہ ہوجاتے تھے:

یا الٰہی تو نہ چھوٹے ترا چھٹنا ہے غضب
یوں میں راضی ہوں مجھے چاہے زمانہ چھوڑ دے(۱)

ان کو اس وقت اپنا حقیقی باپ وہ نظر آتا ہے جو دین میں ان کی حمایت اور اتباع سنت پر معاونت کرے۔ یہ اپنا بھائی بند اس کو سمجھتے ہیں جو اسلام میں اس کی قوت بازو بنے:

---

(۱) حضرت مفتی صاحبؒ نے تحریک آزادی کے زمانے کی جو بحث چھیڑی ہے وہ قابل توجہ ہے، بلکہ یہ تحریر ہی تحریک آزادی کے اس دور کی ہے جب حضرت مفتی صاحبؒ کے مرشد اول شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن محدث دیو بندی نور اللہ مرقدہ، اسی تحریک میں حصہ لینے کی پاداش میں مالٹا کے قید خانے میں مقید تھے، اور حضرت مفتی صاحبؒ کے حالاتِ زندگی سے یہ بھی اظہر من الشمس ہے کہ وہ حضرت شیخ الہند علیہ الرحمہ کی تحریک میں شریک نہیں تھے، بلکہ متفق بھی نہیں تھے اور عملاً مخالف تھے۔ یہاں اس تحریر میں حضرت مفتی صاحبؒ نے دبے الفاظ میں جنھیں نشانہ بنایا ہے، ان کا تعین کرنا اور ان کے ناموں کی صراحت کرنا ’’قوم کی بہبود‘‘ کے لیے فرض تھا، تا کہ دیکھا جاتا کہ وہ شخصیات کون ہیں؟ اگر حضرت مفتی صاحبؒ کا ان شخصیات سے کسی قسم کا تعلق رہا ہے تو اس تعلق کا کیا حکم ہوگا؟ (شریفی)

ہزار خویش کہ بے گانہ از خدا باشد
فدائے یک تن بے گانہ کاشنا باشد

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی اپنے بیٹے سے ناراضگی :

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محض ایک ذراسی بے ادبی پر جو درحقیقت بے ادبی بھی نہ تھی، تمام عمر اپنے بیٹے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے کلام نہیں کیا۔ (کما فی المشکوٰۃ باب الجماعۃ وفضلہا)

وعن بلال بن عبداللہ ابن عمر عن ابیہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تمنعوا النساء حظوظھن من المساجد اذا ستأذ لکم فقال بلال واللہ لمنعھن فقال لہ عبداللہ اقوال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و تقول انت لنمنعھن وفی روایۃ سالم عن ابیہ قال فاقبل علیہ عبداللہ فسبّہ سبا ما سمعت سبہ مثلہ قط (الحدیث) (رواہ مسلم وفی روایۃ مجاھد عن عبداللہ بن عمرؓ قال فما کلمہ عبداللہ حتی مات). (رواہ احمد)

''حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کے بیٹے حضرت بلالؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں، فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ عورتوں کو مسجد میں جا کر اپنا حصۂ ثواب حاصل کرنے سے منع نہ کرو، اگر وہ تم سے اجازت طلب کریں۔ میں (یعنی حضرت بلالؓ) نے کہا کہ اللہ کی قسم! ہم تو اُن کو ضرور منع کریں گے۔ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے (غصہ ہوکر) فرمایا کہ

میں تو کہتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور تو کہتا ہے کہ ہم منع کریں گے؟ اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے بھائی حضرت سالمؒ روایت کرتے ہیں کہ پھر حضرت عبداللہؓ (یعنی والد) حضرت بلالؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کو اتنا سخت وسست کہا کہ میں نے والد کی زبان سے کبھی ایسا نہ سنا تھا، اور مجاہدؒ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ پھر حضرت ابن عمرؓ نے مرتے دم تک حضرت بلالؓ سے کلام نہیں کیا۔"

اب دیکھیے کہ اس میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اس کے سوا کیا خطا تھی کہ صورتاً حدیث کا مقابلہ سا ہو گیا۔ ورنہ اس قول کے کہنے والے تنہا حضرت بلالؓ نہ تھے بلکہ اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کسی قدر فتنہ و فساد شائع دیکھ کر یہی رائے قائم کی تھی کہ اب عورتوں کا مسجد میں جانا مصلحت نہیں۔ اب منع ہی کرنا اولیٰ ہے۔ وہ سمجھے کہ اگر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ فتنہ وفساد ہوتا تو آپ بھی یقیناً منع فرما دیتے۔ چناں چہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

لو ادرك رسول الله صلى الله عليه وسلم ما احدث النساء لمنعهن كما منعت نساء بني اسرائيل. (رواہ البخاری)

"اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ حالت دیکھتے جو آج عورتوں میں پیدا ہو گئی ہے (کہ خوشبو لگا کر اور بن ٹھن کر مساجد میں جاتی ہیں) تو بے شک ان کو منع فرما دیتے، جیسا کہ بنی اسرائیل کی عورتیں منع کر دی گئیں تھیں۔"

کیوں کہ وہ خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں اس قسم کے ارشادات پاتے تھے، جیسا کہ خود حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما ہی سے روایت ہے:

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم لا تمنعوا نسائکم المساجد و بیتھن خیر لھن. (رواہ ابوداؤد)

"فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ عورتوں کو مساجد میں جانے سے منع (تو) نہ کرو، (مگر) ان کے لیے افضل ان کے گھر ہی ہیں۔"

اور حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم صلوٰة المرءة بیتھا افضل من صلوٰتھا فی حجرتھا و صلوٰتھا و مخدعھا افضل من صلوٰتھا فی بیتھا.

"فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ عورت کی نماز چھپے ہوئے مکان میں صحن سے بہتر ہے، اور چھپے ہوئے مکان کے اندر کی کوٹھڑی میں چھپے ہوئے مکان سے بہتر ہے۔"

بالجملہ نصوص کے اشارات اور احادیث کے قریب بہ صراحت رموز سے یہ بات صحابہ رضی اللہ عنہم کو متیقن ہو گئی تھی کہ اب وقت اسی کا ہے کہ عورتوں کو مساجد میں جانے سے بالکل منع کر دیا جائے، تو اب حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اگر و اللّٰہ لنمنعھن اللہ کی قسم ہم تو ضرور منع کریں گے، کہا تو کیا قصور کیا؟ ایک صحیح اور درست مسئلہ بیان کیا تھا۔ البتہ طرز بیان ٹھیک نہ تھا، کیوں کہ صورتاً حدیث کے ساتھ معارضہ سا ہو گیا۔

مگر حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما جو اتباع سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں معروف و مشہور ہیں، جن کی عادت تھی کہ جس جگہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کو ایک مرتبہ پیشاب کرتے ہوئے دیکھ لیا تو جب کبھی اُس راستے پر گزرتے سواری سے اُتر کر پیشاب بھی نہ آتا تھا تو پیشاب کرنے کی صورت بنا کر بیٹھ جاتے تھے۔ وہ کب اتنی بات کا تحمل کر سکتے تھے؟ حضرت بلالؓ کے اس حدیث کے ساتھ صوری اور ظاہری معارضے نے اُن کے قلب پر ایک ایسا صدمہ پیدا کر دیا کہ عمر بھر کے لیے اپنے لختِ جگر سے کلام کرنے کو جی نہ چاہا۔

تہذیب الفاظ کا سبق بھی یاد کیجیے:

اس قسم کے واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ شریعت نے جیسے ہمیں حقیقی معنوی ادب اور تہذیب کا سبق دیا ہے ایسے ہی تہذیب الفاظ اور عنوان و تعبیر بیان میں بھی ادب ملحوظ رکھنے کا امر فرمایا ہے۔ اس کے شواہد قرآن و حدیث میں بہ کثرت ملتے ہیں کہ بہت سے اوامر اور نواہی شریعت کے محض ادب لفظ پر آتے ہیں۔ کیوں کہ بعض اوقات ایک صحیح واقعی اور نافع بات طرز بیان کے کریہہ اور برا ہونے سے شرعاً و عرفاً ناگوار اور ناجیز ہو جاتی ہے۔ اگر زمانے نے فرصت دی تو ان شاء اللہ تعالیٰ اس عنوان پر ایک مستقل مضمون ہدیۂ ناظرین ہوگا، ورنہ ع

فکم حسرات فی بطون المقابر

"بہت سی حسرتیں قبروں کے اندر ہیں۔"

یہاں تو صرف ایک ایسے ہی واقعے کے جو حضرت امام ابو یوسفؒ کے ساتھ پیش آیا ہے، نقل کر دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔

توبہ کر، ورنہ......

حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ حدیث بیان فرمارہے تھے کہ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کدو بہت مرغوب تھا۔ آپ پیالے میں سے اس کے قتلے ڈھونڈ ڈھونڈ کر کھایا کرتے تھے۔ ایک شخص بول اٹھا کہ مجھے مرغوب نہیں۔ حضرت امام ابو یوسفؒ غصے سے بے تاب ہو گئے اور فوراً تلوار کھینچی کہ یا تو ابھی توبہ کر، ورنہ اسی وقت سر قدموں میں لڑھکتا ہوا دیکھے گا۔ اس شخص نے توبہ کی۔

یہاں بھی اس کا جرم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اس نے ایک صحیح اور جائز امر کو اسی طرح بیان کیا کہ صورت حدیث سے معارضہ ہو گیا، ورنہ کدو کا مرغوب طبع ہونا نہ شرعاً ضروری ہے اور نہ کسی کے اختیار میں۔ بعض مرتبہ آدمی ایک چیز کو عقل سے جانتا ہے کہ نہایت لطیف اور عمدہ ہے مگر طبیعت کو مرغوب نہیں ہوتی، اور نہ یہ اس کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ البتہ کدو کو عقلاً بُرا جاننا یا بُرا کہنا بے شک مکروہ ہوگا، اور کسی کو طبعاً بھی مرغوب ہو تو اُس کی خوش نصیبی اور خوبی قسمت ہے کہ طبیعت کو بھی وہی چیز مرغوب ہے جو حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مرغوب تھی۔ یہ کچھ نصیبہ وری نہیں؟ ع

بلبل ہمیں کہ قافیۂ گل شود بس است

أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (سورۃ فتح: ۲۹)

''کفار پر سخت اور آپس میں نرم کے مصداق۔''

الحاصل یہ حضرات اگر علم و بردباری، مواخات و حسن معاشرت، ایثار و تواضع میں مرتبۂ کمال کو پہنچے ہوئے تھے تو ساتھ ہی غضب فی اللہ اور تصلب فی الدین میں بھی انتہائی درجہ رکھتے تھے۔

حضرت صدیق اکبرؓ کا حلم:

اگر ایک جانب میں ان کے حلم اور تواضع کے عجیب وغریب واقعات سے آج تاریخی دنیا معمور اور لب ریز نظر آتی ہے، ان کے حسن معاشرت کا ایک ادنا اثر ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں حضرت طلحہ ابن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کو ایک جاگیر عطا فرمائی اور اس کے لیے ایک خط لکھ کر اس میں چند آدمیوں کو گواہ بنایا، جن میں سے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ اس کے بعد حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ وہ خط لے کر حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس مہر کرانے کے لیے آئے تو انہوں نے انکار کر دیا۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ غصے میں بھرے ہوئے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا:

ما ادری انت الخلیفة ام عمر

''میں نہیں جانتا کہ خلیفۃ المسلمین آپ ہیں یا عمر؟

آپ مجھے جاگیر دیں اور وہ اُس سے انکار کریں؟''

اب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کی معاصرت پر نظر فرمائیے جو طبعاً خلاف پیدا کرنے والی ہے، اور پھر اُس پر یہ طرہ کہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کا بیان ایسا اشتعال انگیز اور حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کا جواب ملاحظہ کیجیے۔ فرماتے ہیں:

بل عمر لکنه انا (ادب الدنیا والدین: ص ۶۲)

''بلکہ خلیفہ تو عمرؓ ہی ہیں لیکن عمر میں ہی تو ہوں۔''

سبحان اللہ! کیا عجیب جواب ہے کہ سائل کو کچھ چوں و چرا کی گنجائش نہ رہی اور واقعیت کا بھی اظہار ہو گیا۔

جس نے اللہ کے بہت گناہ کیے اسے خوب مار:

ان حضرات کے حلم کے سوانح میں اس قسم کے واقعات ایک ادنا مرتبہ رکھتے ہیں۔ اسی کی ایک ادنا مثال ہے کہ حضرت ابراہیم ابن ادہم رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ اپنے آقا کے لیے کچھ انگور توڑ رہے تھے، جس نے ان کو اپنے انگوروں کے باغ کی خدمت پر مقرر کیا تھا۔ ایک شخص آیا اور اُس نے انگور طلب کیے۔ انہوں نے کہا کہ مالک کی اجازت نہیں۔ اس ظالم نے ایک سنی نہ دو، انگور لینے کے سوا حضرت ادہمؒ کے سر پر کوڑے کی ضرب شروع کی۔ حضرت ادہمؒ نے سر جھکا دیا اور فرمایا:

اضرب راساً ظالما عصی اللّٰہ تعالیٰ (کتاب الخلاۃ: ص ۲۲۳)

''اس ایسے سر کو جس نے اللہ تعالیٰ کے بہت گناہ کیے ہیں خوب مار۔''

حضرت معاویہؓ کا واقعہ:

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ کچھ چادریں تقسیم کیں، ان میں سے ایک چادر ایک دمشقی بوڑھے کو بھی عطا فرمائی۔ وہ بڑے میاں کو پسند نہ آئی اور غصے میں قسم کھا بیٹھے کہ اس کو معاویہ (رضی اللہ عنہ) کے سر ماروں گا۔ اس کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر واقعے کا اظہار کیا۔ اس پر حضرت امیر المؤمنین جواب سُن کے فرماتے ہیں:

وّف بنذرك وليرفق الشيخ بالشيخ (ادب الدنیا والدین: ص ۹۸)

''تو اپنی نذر (میرے سر میں مار کر) پوری کرلے، اور یہی چاہیے کہ بوڑھا (یعنی میں) بوڑھے کے (یعنی تیرے) ساتھ نرمی کرے۔''

اعلیٰ وادنا کا لحاظ:

حضرت احنف ابن قیس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب مجھ سے کوئی دشمنی کرتا ہے تو میں دیکھتا ہوں کہ یہ کون ہے، اگر مجھ سے اعلیٰ ہوتا ہے تو میں اُس کے مرتبے کے لحاظ سے درگزر کرتا ہوں، اور اگر ادنا ہے تو اپنے مرتبے کے لحاظ سے چپ ہو رہتا ہوں:۔

نہ باز آے فلک گو ہمارے کینے سے
کسے دماغ کہ ہو دُو بہ دُو کمینے سے

اور اگر کوئی میرا مقابل ہے تو میں اُس پر احسان کرتا ہوں، اور خلیل نے اس مضمون کو اپنے اشعار میں اسی طرح ادا کیا ہے:۔

سالزم نفسی الصفح عن کل مذنب
وان کثرت منہ الیّ الجرائم
فما الناس الاواحدا من ثلثۃ
شریف ومشروف و مثل مقاوم
فاما الذی فوقی فاعرف قدرہ
واتبع فیہ الحق والحق لازم
واما الذی دونی فاحلم دائباً
اصون بہ عرضی وان لام لائم
واما الذی مثلی فان زلّ اوھفا
تفضلت ان الفضل بالفخر حاکم

(ادب الدنیا والدین: ص ۵۹)

''میں ہر مجرم سے درگزر کرنے کا التزام کروں گا، اگرچہ مجھ پر اس کی

خطائیں بہت ہو جائیں، اس لیے کہ تمام آدمی تین قسم کے سوا نہیں: یا (مجھ سے) اعلیٰ ہے یا ادنا اور یا ہم سر مقابل۔ تو جو شخص مجھ سے اعلیٰ ہے اُس کی تو قدر شناسی کروں گا اور اس میں حق کا اتباع کروں گا، اور حق ہی لازم ہے، اور جو شخص مجھ سے ادنا ہے اس سے اپنی آبرو بچاؤں گا، اگرچہ کوئی ملامت کیا کرے، اور اس شخص پر جو میری مثل ہے اگر اُس سے لغزش ہوگئی یا اُس نے ظلم کیا تو میں احسان کروں گا، اس لیے کہ احسان فخر حاکم ہے۔"

تو اسی طرح ان کا شدت فی امر اللہ اور بغض فی اللہ میں مرتبۂ کمال پر ہونا بھی کسی پر مخفی نہیں۔ اُن کی علو ہمت اور اولوالعزمی کے کارنامے دنیا میں حامل اور مفقود نہیں۔

ارحم الامت:

وہی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:

ارحم امتی بامتی ابوبکر

"میری امت میں سے مسلمانوں پر سب سے زیادہ مہربان ابوبکر (رضی اللہ عنہ) ہیں۔"

سے خطاب فرماتے ہیں، اور جن کے حلم و بردباری کا ایک ادنا اثر تھا، جسے آپ پڑھ چکے ہیں۔ جب حضرت ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ [1] (جن کے لیے بہ جرم زنا جناب رسالت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنگ سار کردینے کا حکم ہوا تھا) سزائے خداوندی جاری کرنے کے لیے تشریف لاتے ہیں تو اگر کچھ اور چیز ہاتھ میں نہیں آتی تو شدت غضب سے ایک اونٹ کے جبڑے ہی کی ہڈی اُس کے سر پر پھینک مارتے ہیں۔

یہی ''ارحم الامت'' اتنے رفیق القلب جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بعض اقوام کو دیکھتے ہیں کہ انہوں نے اموال کی زکوٰۃ نکالنی ترک کر دی تو سب سے پہلے اُن کے ساتھ جہاد کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں، بلکہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کو جہاد میں اتنی جلدی کرنے میں کچھ تامل بھی رہا، حتیٰ کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو جو

اشد هم فی امر اللّٰہ عمر

''صحابہ میں سے اشد اللہ کے معاملے میں عمر (رضی اللہ عنہ) ہیں۔''

کا خطاب رکھتے ہیں، اس میں کچھ پس و پیش ظاہر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

کیف تقاتل الناس وقد قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا اله الا اللّٰہ ومن قال لا اله الا اللّٰہ عصم منی ماله و نفسه.

''ان لوگوں سے آپ کیسے مقاتلہ کرتے ہیں؟ حال آں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مجھے امر کیا گیا ہے کہ لوگوں سے مقاتلہ کرتا رہوں، جب تک کہ وہ لا الٰہ الا اللہ کہیں، اور جو شخص لا الٰہ الا اللہ کہہ لے گا مجھ سے اپنے جان مال بچا لے گا۔''

لیکن ارحم امت ہیں کہ فرماتے ہیں:

---

(۱) یہ ایک صحابی ہیں جو بشریت سے ایک مرتبہ بدفعلی میں مبتلا ہو گئے تھے، مگر اس کے بعد عاقبت کا خوف اتنا غالب ہوا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہتے ہیں کہ یا رسول اللہ! مجھ سے زنا سرزد ہو گیا ہے (اب میری نجات کی کیا صورت ہے؟) اور اس پر طرہ یہ کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اعراض فرماتے ہیں، اور وہ بار بار وہی اقرار کیے جاتے ہیں۔ آخر جب وہ اسی پر مصر رہے تو آپ نے حکم فرمایا کہ ان پر شرعی سزا جاری کی جائے یعنی پتھروں کی بوچھاڑ سے جان لے لی جائے۔ ہذا حاصل ما رواہ الترمذی: ص ۱۷۱ (شفیع)

والله لا قاتلن من فرق بين الصلوٰة والزكوٰة لم منعوني عقالاً كانو ايؤدونها الى رسول الله صلى الله عليه وسلم لقاتلتهم على منعه.

''اللہ کی قسم! میں اُس سے ضرور مقاتلہ کروں گا جو نماز، زکوٰۃ میں فرق کرے گا (نماز کو فرض سمجھے اور زکوٰۃ کو فرض نہ جانے)، اور اگر وہ مجھ سے ایک رسی بھی روک لیں گے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ادا کرتے تھے تو میں اُن سے اس کے روکنے پر بھی مقاتلہ کروں گا۔''

الغرض ان حضرات کا حلم و ترحم ہی اگر چہ نوع انسان سے متجاوز ہو کر کل ذات کبد رطبة تک پہنچتا ہے، لیکن جب وہ کسی منکر شرعی کو دیکھتے ہیں کہ غصے میں بھی:

اتقوا غضب الحليم

''بردبار کے غصے سے ڈرو۔''

پکار اُٹھتا ہے۔ اُن کی رعایت اور تسامح فقط دنیاوی امور میں تھی۔ دین کے مقابلے میں ان کا کوئی عزیز عزیز تھا اور نہ کوئی مخلص دوست دوست۔ ہماری طرح اُن کو شریعت اور دین سے عناد نہ تھا کہ یوں تو جہاں دیکھو نا اتفاقی اور شکر رنجی، جسے دیکھو بھائیوں اور دوستوں کا شاکی، نا اتفاقی کا بھوت سر پر سوار، عزیز و اقربا سے دن رات مقدمے بازیاں، بغض و حسد سے دل لب ریز، ذرا ذرا سی بات پر بدلحاظی، بد خلقی، تلخ کلامی، قطع رحمی سب کچھ کر جائے، لیکن جب کوئی دین کا معاملہ ہو، جہاں شریعت حکم کرے کہ اس وقت سکوت جائز نہیں، اس وقت رعایت اور تسامح کو اُٹھا رکھنا چاہیے۔ وہاں آنکھ کا لحاظ بھی آتا ہے اور کہیں کہیں کے تعلقات اور دور دراز کی قرابتیں بھی پیش نظر ہوتی ہیں۔ دوستی اور محبت کے تعلقات اور تمام رشتے ناتے یہیں ختم ہوتے ہیں۔ سچ ہے:

نزلہ بر عضو ضعیف مے ریزد!

حال آں کہ اگر کوئی سننے والا کان اور سمجھنے والا دماغ رکھتا ہے تو بے تامل سمجھ سکتا ہے کہ محبت اور قرابت کا حقیقی مقتضا یہ ہے کہ پریشانی اور بے کسی کے وقت اس کی قوت بازو بنے اور کس مپرسی کی حالت میں اس کا غم گسار ہو، اور ظاہر ہے کہ روزِ قیامت سے زیادہ سراسیمگی اور پریشانی کا کون سا وقت ہوگا؟ جب کہ نہ کوئی دوست کسی دوست کا ساتھ دے سکے گا اور نہ کوئی عزیز کسی عزیز کا۔

لَا يَسْئَلُ حَمِيْمٌ حَمِيْماً (سورۂ معارج:۱۰)

"(اُس دن) کوئی دوست کسی دوست کو نہ پوچھے گا۔"

جب کہ باپ بیٹے سے اور بیٹے والدین سے بھاگتے پھریں گے:

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ. (سورۂ عبس:۳۴ تا ۳۷)

"جس دن کہ آدمی اپنے بھائی اور والدین اور زوجہ اور اولاد سے بھاگتا پھرے گا، اور جس دن کہ ہر ایک اپنی اپنی فکر میں مستغرق ہوگا۔"

عقل مند کی دوستی کیسی ہو؟

تو اب ایک عاقل کی دوستی اور محبت کا اقتضا اس کے سوا نہ ہونا چاہیے کہ اُس وقت کی پریشانی ہٹانے میں اپنی امکانی کوشش صرف کرے، اور وہ یہی ہے کہ اس کو دنیا میں ایسے اعمال سے روکے جو باعث ہلاکت ہوں، اور منجیات کی طرف بلائے:

محبتي فيك تأبى عن مسامحتي

بان اراك على شيء من الزلل

"مجھے جو محبت تمہارے ساتھ ہے اس سے منع کرتی ہے کہ میں تمہیں کسی
ذرا سی خطا میں مبتلا دیکھوں اور چشم پوشی کروں۔"

تاکہ دنیا کے دوروزہ تعلقات آخرت کے لیے ہمیشہ کا وبال نہ بن جائیں، بلکہ اگر توفیق خداوندی معین ہو تو ایک دوراندیش متمدن انسان کا سب سے پہلا فرض ہے کہ دنیا میں رہ کر جو تعلقات انسان کے لیے لابدی (ضروری) ہیں وہ اس پیمانے پر رکھے کہ دنیا میں راحت اور تفریح کا سامان ہو۔ ضرورت کے وقت اپنی قوت بازو بنیں، اور تعلقات وہ قایم کرے جن کی عمر اپنی عمر کے ساتھ ختم نہ ہو جائے، جن کی بقا بہ قول عارف نظامی:۔

ہمہ دوستاں تا بد رہا منند
چو من رفتم ایں دوستاں دشمنند

ہمارے دروازۂ قبر تک نہ ہو بلکہ ذخیرۂ آخرت بنے اور اُن دوستوں کے زمرے میں داخل ہو جن کے متعلق بشارتوں سے حدیث اور قرآن بھرے ہوے ہیں۔ جن پر میدانِ حشر میں عنایات خداوندی کا ٹھنڈا سایہ ہوگا۔

چناں چہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول اللّٰہ تعالیٰ یوم القیٰمۃ این المتحابون بجلالی الیوم اظلھم من ظلی یوم لاظل الاظلی۔ (رواہ مسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ آج میرے لیے آپس میں دوستی کرنے والے کہاں ہیں؟ آج میں اُن پر اپنا سایہ ڈالوں گا جب کہ میرے سوا کسی کا سایہ نہ ہوگا۔"

چوں کہ انسان مدنی الطبع ہے، میل ملاقات ہی سے اس کی زندگی بسر ہو سکتی ہے۔ جس کام کو چند اپنے سچے اور مخلص دوستوں کے ساتھ مل کر کرتا ہے خواہ وہ دین کا ہو یا دنیا کا، وہ خود ایسی خیر و برکت لیے ہوے ہوتا ہے جو تنہا کرنے میں کبھی نہیں آسکتی۔ دنیاوی امور میں تو اکیلا رہ کر انسان کو چند گھنٹے بھی زندہ رہنے کا سخت متعذر ہونا بالکل ظاہر ہی ہے، دینی امور بھی اس سے خالی نہیں۔

مامون اور حسن ابن سہل میں عجیب مکالمہ:

ایک ادنا امر ہے کہ اگر چند مسلمان بھائیوں کا اجتماع نہ ہو تو پنج گانہ نماز کی جماعت کے اجر جزیل سے محروم رہے۔ اکثر اُمور دینیہ و دنیویہ میں خداوند عالم کو مسلمانوں کی اجتماعی صورت کچھ عجیب محبوب ہے، اسی لیے اُن دو دوستوں کے متعلق جن کی دوستی اور محبت صلاحیت اور تدین پر مبنی ہو، حدیث میں وہ بڑی بڑی بشارتیں وارد ہیں کہ سن کر تعجب ہوتا ہے۔ کیوں کہ دوستوں کے ساتھ اختلاط و مجالست، مواکلت و مشاربت تو بہ ظاہر ایک دنیا کا بہترین شغل ہے، جو ایک شریف طبیعت کے لیے سیکڑوں لذیذ کھانے اور پینے کی نعمتوں سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ اسی لیے جب ایک روز مامون اور حسن ابن سہل میں لذات اور نعم کا ذکر آیا تو مامون نے کہا کہ میں نے تمام لذت کو دیکھا مگر سات لذتوں کے سوا کسی کو نہ پایا کہ بعد چند روز کے اُس سے جی نہ بھر جاے اور طبیعت نہ اُکتا جاے۔

حسن: اے امیر المومنین! وہ سات کیا ہیں؟

مامون: ۱۔ گیہوں کی روٹی، ۲۔ بکری کا گوشت، ۳۔ ٹھنڈا پانی، ۴۔ نرم کپڑا، ۵۔ خوش بو، ۶۔ نرم بستر اور ۷۔ خوب صورت چیز کی طرف دیکھنا۔

حسن: اے امیر المومنین! اور دوستوں کے ساتھ مجالست اور کلام کو بھول گئے؟

مامون: تم نے سچ کہا، یہ تو اُن سب میں اول درجہ رکھتی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ قیامت کے روز جیسے گناہ گاروں کو قسم قسم کے عذاب ہوں گے اُن میں سے بعض لوگوں کو یہی عذاب ہوگا کہ اس کو دوستوں اور عزیز و اقربا سے جدا کر دیا جائے گا۔

(مستطرف: ج ا، ص ۱۰۷)

فقہا نے کہا ہے کہ جس کی مِلک میں ایک بچہ اور اُس کی ماں آجائے اُس کے لیے جائز نہیں کہ بچے کو ایک شخص کے ہاتھ پر فروخت کر دے اور ماں کو دوسرے شخص کے ہاتھ پر، بلکہ اگر بیچ کا ارادہ ہے تو دونوں کو ایک ہی شخص کے ہاتھ فروخت کرے، ورنہ حدیث میں ہے:

من فرق بین والدة وولدها فرق الله بینه وبین احبته یوم القیامة.

''جو شخص ایک بچے اور اُس کی والدہ میں تفریق ڈالے اللہ اُس میں اور اُس کے دوستوں میں قیامت کے دن تفریق ڈالے گا۔''

جوانی اور دوستوں کا چھن جانا:

حقیقت یہ ہے کہ دوستوں اور اقارب کی مفارقت ایک بڑا عذاب ہے، ولنعم ما قیل: ؎

شیئان لو بکت الدماء علیهما

عیناك وحتی توذنا بذهاب

لم تبلغا المعشار من حقیهما

فقد الشباب وفرقة الاحباب

"دو چیزیں ایسی محبوب ہوتی ہیں کہ اگر آنکھیں اُن پر خون روتی ہیں یہاں تک کہ جاتی رہیں، تب بھی اُن دونوں چیزوں کے حق کا دس واں حصہ بھی ادا نہ کرسکیں گی، (اور وہ دونوں چیزیں) جوانی کا چلا جانا اور احباب کا فراق ہے۔"

رحمت خداوندی:

الحاصل رحمت خداوندی دیکھیے کہ دنیا میں یہ لذت و راحت اور پھر اُس پر یہ درجات اُخروی کی بشارتیں، عجیب ہم خرما ہم ثواب ہیں۔ دیکھیے! حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان من عباد اللّٰہ لا ناساً ما ھم بانبیاء ولا شھداء یعبطھم الانبیاء والشھداء یوم القیمة بمکانھم من اللّٰہ قالوا یا رسول اللّٰہ تحبرنا من ھم قال ھم قوم تحابوا بروح اللّٰہ علی غیر ارحام بینھم ولا اموال یتغاطونھا فو اللّٰہ ان وجوھھم لنور و انھم لعلی نور لا یخافون اذا خاف الناس ولا یحزنون اذا حزن الناس وقرأ ھذا الایة اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ (رواہ ابوداود)

"فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے: اللہ کے بندوں میں سے بعض آدمی ایسے ہوں گے جو نہ انبیا ہوں گے نہ شہدا، (مگر) انبیا اور شہدا ان پر بہ وجہ قربت من اللہ کے غبطہ کریں گے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یارسول

اللہ! ہمیں بتلایئے وہ کون لوگ ہوں گے؟ فرمایا: یہ وہ لوگ ہوں گے جو باوجود قرابت نہ ہونے کے خالصتاً للہ آپس میں محبت سے رہے۔ اللہ کی قسم اُن کے چہرے نور کے ہوں گے اور وہ نور پر ہوں گے۔ جس وقت سب لوگ خوف میں ہوں گے اُن کو کوئی خوف نہ ہوگا اور جب سب کے سب غم گین ہوں گے اُن کو کوئی غم نہ ہوگا، اور یہ آیت تلاوت فرمائی: اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔"

محبت اور قرابت کا پاس کہاں تک ہو؟

الغرض انسان کو چاہیے کہ تعلقات وہ پیدا کرے جو دنیا میں راحت اور فرحت کا باعث ہوں اور آخرت میں اس کو ان بشارتوں کا مستحق بنائیں، نہ وہ کہ جن میں دنیا کی پنج روزہ عیش ہمیشہ کے لیے وبالِ جان بن جائے:

ولا خير في عيش امرءٍ لم يكن له

من الله في دار القرار نصيبُ

"اُس شخص کی عیش میں کوئی خیر نہیں جس کے لیے اللہ تعالیٰ کے نزدیک دارِ آخرت میں کوئی حصہ نہ ہو۔"

محبت اور قرابت کا پاس ولحاظ وہیں تک کرے کہ جہاں تک شریعت نے اجازت دی ہے، تاکہ ایک روز یہ کہنا نہ پڑے:

يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا (سورۂ فرقان:۲۸)

"کاش! میں فلانے کو دوست نہ بناتا۔"

اور یہی دوست واحباب عزیز وقریب کل اُن دوستوں میں سے نہ ہوجائیں جن

کی قرآن خبر دیتا ہے:

اَلۡاَخِلَّآءُ یَوۡمَئِذٍۭ بَعۡضُهُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الۡمُتَّقِیۡنَ

(سورۂ زخرف:۶۷)

''قیامت کے دن متقین کے سوا سب دوست ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے۔''

بالجملہ ایک عاقبت اندیش کی سچی محبت اور دوستی کا اقتضا یہی ہونا چاہیے کہ دوست کو کسی منکرِ شرعی میں مبتلا پائے تو اُس کو منع کرنے میں اس کا خیال نہ کرے کہ یہ مجھ سے رنجیدہ ہوگا یا اس کی طبیعت پر ملال آئے گا؟ ؎

ما انا صحتك خبايا الود من رجل

مالم تنلك بمكروه من العذل

''کسی شخص کی پوشیدہ محبت تیری خیر خواہی نہیں کر سکتی، تاوقتے کہ تجھ کو ملامت کی ناگوار بات نہ پہنچ جائے۔''

حضرت انس ابن مالک رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا ہے:

المومن مرآة المومن اذا رائی فیه عیباً اصلحه

(ادب الدنیا والدین:ص ۹۴)

''ایک مسلمان دوسرے مسلمان بھائی کے لیے آئینہ ہے، کہ جب اُس میں کوئی عیب دیکھے تو اصلاح کرے۔''

اسی کو شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے بے تکلف فرمایا ہے: ؎

دوست آنست کو معایب دوست

ہم چو آئینہ رو بہ رو گوید

سلف صالحین ایسے دوستوں کی قدر کرتے تھے جو اپنے عیوب کی اصلاح کریں۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

رحم اللّٰہ امرًا ھدی الینا مساوینا

''اللہ اُس شخص پر رحم فرمائے جس نے ہم سے ہماری برائیاں بیان کردیں۔''

ہمارے دل امانت سے بے بہرہ ہو گئے:

اور آج جب کہ ہم سلف کے اُسوۂ حسنہ کو چھوڑ کر ہوا و ہوس کے بندے بن گئے، ہمارے قلوب تدین اور امانت سے بے بہرہ ہو گئے تو دوستی اور محبت کا یہ مطلب ہو گیا کہ من ترا حاجی بہ گویم تو مرا حاجی بہ گو۔ بجائے اس کے کہ احباب کے عیوب کی اصلاح کی فکر کی جائے اُن کو بہ نظر استحسان دیکھا جاتا ہے، تو اسی مضمون کو حضرت ابوالاسود دوئلی تابعیؒ[۱] نے جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں، اس نظم میں ادا کیا ہے: ؎

ذھب الرجال المقتدی بفعالھم
والمنکرون لکل امر منکر
وبقیت فی خلف یزین بعضھم
بعضا لیدفع معور عن معرر
حلف الزمان لیأتین بمثلھم
حنثت یمینک یازمان فکفر

''وہ لوگ تو چل دیئے جن کے افعال کا اقتدا کیا جاتا تھا اور جو ہر بُری بات کو منع کرنے والے تھے، اور ہم ایسے ناخلف لوگوں میں رہ گئے جو ایک

دوسرے کی تعریف کرتے ہیں، تاکہ ایک کانا دوسرے کانے کے عیب کو دفع کرے۔ زمانے نے قسم کھائی تھی کہ میں اُن کی نظیریں اور بھی دکھلاوں گا۔ اے زمانہ! تیری قسم ٹوٹ گئی، کفارۂ قسم ادا کر۔"

حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم جن کا اتحاد و اتفاق، محبت و مودت، مواسات و غم خواری دنیا کی کسی قوم میں اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ آج ایک ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے والے بھائیوں میں اس اخوت و ہمدردی کا عشر عشیر بھی نہیں پایا جاتا جو اُن مکہ کی پہاڑیوں اور مدینہ کے نخیل (درختوں) میں رہنے والے مختلف المزاج مہاجرین و انصار میں تھا، جو ایک دوسرے کے حقیقی اعضا تھے۔ جب کسی بھائی سے شرعی امر میں کوئی کوتاہی ہوتی ہے یا اُس کو کسی منکر میں مبتلا پاتے ہیں تو واقعات شاہد ہیں کہ سب سے پہلے اُس کو ملامت کرنے والے وہی ہوتے ہیں۔

حضرت معاویہؓ اور حضرت عمرؓ کا مکالمہ:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ

---

(۱) فن نحو کے سب سے پہلے مدون بھی تابعی ہیں۔ نقل ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ ایک روز ایک کوچے سے گزر رہے تھے، ایک شخص کو قرآن شریف کی تلاوت کرتے ہوئے پایا، دیکھا تو وہ آیت: بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِیْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ وَرَسُوْلُهٗ کو غلط اس طرح پڑھتا تھا کہ رَسُوْلُهٗ پر بجائے رفع کے جر (زیر) پڑھتا تھا۔ حضرت علیؓ نے اُس کی تصحیح کر دی اور واپس تشریف لا کر اپنے شاگرد ابوالاسود دؤلیؒ سے فرمایا کہ کیا تم ہماری زبان (عربی) کے لیے کوئی ضابطہ تیار کر سکتے ہو کہ جس کی وجہ سے عجمی لوگ اُس کے اعراب و حرکات میں غلطی نہ کیا کریں؟ ابوالاسودؒ نے عرض کیا کہ کیسے؟ فرمایا: اس طرح پر کہ كل فاعل مرفوع و كل مفعول منصوب و كل مضاف اليه مجرور (ہر فاعل مرفوع ہوتا ہے اور مفعول منصوب اور مضاف الیہ مجرور) اور پھر فرمایا: أنح نحوه (اور اسی طور پر چلو)۔ اسی وجہ سے اس فن کا نام نحو رکھا گیا۔ پھر حضرت ابوالاسودؒ نے اسی طرز پر نحو کے قواعد کا انضباط شروع کیا اور سب سے پہلے باب تعجب لکھا۔ (شفیع)

ملک شام کے والی تھے۔ انہوں نے اُس ملک کی بعض مصالح پر نظر کر کے حکم فرمادیا کہ بلا اجازت کوئی ہمارے پاس نہ آنے پائے اور دروازے پر پہرا قایم کر دیا۔ اسلام کی سادہ سیاست کے خوگر جن کے دلوں پر اسٹامپ اور ٹکٹ کا کبھی خطرہ بھی نہ گزرا ہوگا کہ چند منٹ اجازت طلبی کے لیے خلیفۃ المسلمین کے دروازے پر کھڑے رہنے کو گوارا کر سکتے تھے؟ امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے شکایت کی۔ جب حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ مدینہ سے شام میں تشریف لائے تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ "کب نبیل" (ایک مقام کا نام ہے) تک استقبال کے لیے حاضر ہوئے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اُن سے منہ پھیر لیا۔ اب حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سوار ہیں اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پیادہ پا اُن کے ساتھ ساتھ۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ التفات تک نہیں کرتے۔ حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف رضی اللہ عنہ نے جو اُس وقت وہاں موجود تھے، یہ دیکھ کر عرض کیا کہ امیر المومنین! آپ نے تو معاویہ کو بہت مشقت میں ڈال دیا، تو اب حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ اے معاویہ! آپ میری سواری کے ساتھ ہیں، حال آں کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اہل حاجت آپ کے دروازے پر کھڑے رہتے ہیں اور اُن کو آپ تک اپنے مظالم کی فریاد کی بھی اجازت نہیں ہوتی؟

امیر معاویہؓ: امیر المومنین یہ خبر تو صحیح ہے۔

فاروق اعظمؓ: پھر یہ کیا حرکت ہے؟

امیر معاویہؓ: حضرت! ہمارے ملک میں جاسوس (خفیہ پولیس) کی کثرت ہے۔ غیر ممالک کے جاسوس رہتے ہیں، اور پھر بادشاہی رعب قایم کرنے کے لیے

اس قسم کے امور کی ضرورت ہوئی۔ اب اگر آپ کی رائے ہو تو مجھے حکم دیجیے کہ اس طریق کو جاری رکھوں، ورنہ منع فرما دیجیے کہ میں اس کو ترک کر دوں؟

فاروق اعظمؓ: جو تم نے کہا اگر وہ صحیح ہے تو ایک درست اور صایب رائے ہے، ورنہ یہ ایک لسّــــان (زبانی) دھوکہ ہے، اس لیے نہ میں تمہیں حکم کرتا ہوں اور نہ منع، اب جو تمہیں تمہارا دین اجازت دے وہ کرو۔

اِن حضرات کے اس قسم کے واقعات جو اُن کے امر بالمعروف میں نہایت متصلب ہونے اور اُمور شرعیہ میں کسی کی رعایت نہ کرنے کے شاہد ہیں، دو چار نہیں، دس بیس نہیں کہ کوئی اُن کا استقصا (انتہائی کوشش) کر سکے، عدد رمل وحصی کی نظیر ہیں[1]۔

ہم جن سے نسبت جوڑتے ہیں انہیں کے خلاف چلتے ہیں:

اور آہ! کہ جب ہم اپنے مذہب وملت کا پتہ دیتے ہیں تو اپنے آپ کو اُنہیں اولیا و علما کی طرف منسوب کرتے، اور اپنے شجرے انہیں بزرگانِ دین تک پہنچاتے ہیں، لیکن کیا یہ ہمارے لیے بے حیائی کا انتہائی درجہ نہیں کہ ہمارے قلوب، ہمارے اعضا و جوارح، ہمارے اعمال، ہمارے اقوال، ہماری صورتیں اور ہمارے لباس ہی ہمیں اس دعوے میں جھوٹا ثابت کر دیں؟ ہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشن گوئی ہے:

لا تزال طائفة من امتی منصورین لا یضرھم من خاذلھم حتی تقوم الساعة.

”میری اُمت میں ہمیشہ ایک ایسی فتح مند جماعت باقی رہے گی جس کو

---

(۱) یعنی اس قسم کی مثال میں کئی سارے واقعات ہیں، جو گنتی سے باہر ہیں۔ (شریفی)

اُس کے مخالفین قیامت تک کوئی گزند (تکلیف) نہ پہنچا سکیں گے۔"

جس کے متعلق اکثر علما کی رائے ہے کہ وہ جماعت "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" کرنے والی ہے، اور بعض روایات کے الفاظ بھی اسی خیال کے مؤید ہیں، جن میں اس کے ساتھ:

یَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (سورۂ توبہ:۷۱)

"وہ اچھی باتیں بتاتے اور بُری باتوں سے روکتے ہیں۔"

کی تصریح ہے۔ اس لیے آج بھی دنیا اُن مقدس افراد سے خالی نہیں جو آپ کی پیشن گوئی کے سچے مصداق اور زندہ تصویریں ہیں، اور ان شاء اللہ قیامت تک اُمتِ مرحومہ کے سر سے اُن بزرگوں کا سایہ نہ اُٹھایا جائے گا۔

شاہ اسماعیل شہیدؒ کی فراغت اور دہلی کی بدعات اور ان پر ردّ:

اس آخری دور میں بھی مجدد الملت حضرت سید احمد صاحب بریلوی اور شہید فی سبیل اللہ حضرت مولانا اسماعیل صاحب دہلوی قدس اللہ سرہما ونور مرقدہما تیرھویں صدی میں قرون مشہود لہا بالخیر (۱) کا تماشا دکھلا گئے۔

حضرت شہید رحمۃ اللہ علیہ (۲) جس وقت تحصیل علم سے فارغ ہوئے، دہلی کا پُر فضا گل زار باوجود مسلمانوں کے دارالسلطنت ہونے کے بدعات اور رسوم شرکیہ کے جھاڑ اور کانٹوں سے ایک خارستان نظر آتا تھا۔ جہلا کے من گھڑت اختراعات اور بدعات نے اُس کو ایک بدعت گڑھ بنا رکھا تھا۔ مبتدعین کی کثرت وقوت اور علمائے ربانی کی قلت وضعف نے اُن کے لبوں پر مہر سکوت لگا رکھی تھی۔ خود حضرت شہید رحمۃ اللہ علیہ کے بعض عزیزوں میں یہ بلا پھیلی ہوئی تھی۔

حضرت شہید قدس سرہٗ یہ دیکھ کر ایک روز جمعہ کے بعد جامع مسجد دہلی کے مکبّرے (اذان کی جگہ) پر کھڑے ہوگئے اور یہ آیت کریمہ:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا. (سورۂ نساء:۶۵)

''اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! آپ کے رب کی قسم وہ لوگ مومن و مسلمان نہ ہوں گے جب تک کہ وہ آپ کو اپنے تمام کاروبار میں فیصلہ کن حاکم نہ بنالیں، پھر وہ آپ کے حکم سے دل تنگ نہ ہوں بلکہ اُس کو بہ رضاو رغبت تسلیم کرلیں۔''

پڑھ کر وعظ فرمانا شروع کیا۔ آج پہلا دن ہے کہ دہلی والوں کے کانوں میں اُن کاموں کی بُرائی اور قباحت ڈالی جاتی ہے، جو اُن کے نزدیک فرائض و واجبات سے زیادہ مؤکدہ تھے۔ جس کو دیکھتے ہوئے خیال ہوتا ہے کہ حضرت شہیدؒ کا یہ وعظ: جعجعة و لا طحين (چکی کی آواز ہے مگر آٹا نظر نہیں آتا) کا مصداق ہو کر رہ گیا ہوگا۔

مگر نہیں نہیں! حق میں ایک مخفی قوت ہوتی ہے جو اپنا اثر دکھلاتی ہے اور ضرور دکھلاتی ہے۔ حضرت شہیدؒ نہایت جرأت و بے پروائی کے ساتھ اُن کے ہر ہر خیال کو باطل کرتے ہوئے فرمارہے ہیں کہ دین وعبادت محض اتباع سنت سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا نام ہے۔ من گھڑت بدعات کو اُس میں داخل کرنا جہل مرکب ہے، اور بار بار حافظ شیرازیؒ کا یہ شعر وردِ زبان ہے:

---

(۱) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ اور تابعین وغیرہم رضی اللہ عنہم کا زمانہ۔ (شفیع)

(۲) میں نے یہ واقعہ مخدومی حضرت امیر شاہ خاں صاحب مقیم میرٹھ سے سنا ہے۔ (شفیع) خاں صاحب مرحوم سے روایات ''ارواحِ ثلاثہ'' نامی کتاب میں بھی جمع ہیں۔ (شریفی)

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار
بہ گزارند و سر طرۂ یارے گیرند

اور وہی حق سے ناآشنا کان اور قبر پرست سر ہیں کہ اُن کے سامنے جھکے جاتے ہیں۔ آخر وعظ سے فراغت ہوئی اور نو سو پچاس آدمی اُسی مجلس میں اپنے خیالات سے تایب ہوے۔

حق و باطل آمنے سامنے:

لوگ اپنے اپنے گھروں پر واپس آے۔ اب دہلی جیسا شہر ہے اور اُس کے ہر گھر میں نزاع و جدال کا بازار گرم ہے۔ ہر گھر میں چار آدمی اگر اپنے پرانے خیالات پر مصر ہیں تو ایک وہ بھی ہے جس کو ہدایت خداوندی نے اپنی آغوش میں لے لیا ہے، اور اُس پر حضرت شہیدؒ کی موثر تقریر اپنا رنگ چڑھا چکی ہے۔

تحصیل علم کے بعد یہ پہلا کام ہے جو حضرت شہیدؒ کے ہاتھوں ظہور میں آیا ہے۔ اب آپ ''قیاس کن زگلستانِ بہار مرا'' کے موافق اُن کی عمر بھر کے کارناموں کا اندازہ کرسکتے ہیں۔

مسجد حرام کے دروازے پر تلوار لے کر کھڑے ہوگئے:

آپ جب بہ ارادہ حج بیت اللہ تشریف لے گئے تو بیت اللہ کے اندر مردوں اور عورتوں کو اکٹھے داخل ہوتے دیکھا۔ آپ کو کہاں تاب تھی کہ کوئی امر منکر دیکھیں اور خاموش ہو رہیں؟ تلوار کھینچ کر دروازۂ بیت اللہ پر کھڑے ہوگئے، اور فرمایا کہ واللہ!

---

(۱) فی زماننا ایسی کوئی صورت نہیں ہے۔ اب مرد و زن ایک ساتھ ہی داخل ہوتے ہیں۔ البتہ مسجد نبوی علیہ السلام میں اس کا اہتمام ہے کہ خواتین کے لیے الگ دروازے ہیں۔ (شریفی)

جب تک اسماعیل زندہ ہے مرد اور عورت مل کر بیت اللہ میں داخل نہ ہوسکیں گے۔ یہ دیکھ کر لوگوں میں شور ہوا اور شدہ شدہ (رفتہ رفتہ) یہ خبر ملازمانِ حکومت تک پہنچی۔ حضرت مولانا اسماعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ سے سبب دریافت کیا گیا کہ آپ اتنا تشدد کیوں کرتے ہیں؟ تو فرمایا کہ اُن مردوں کے تہبند دیکھے جائیں جو عورتوں کے ساتھ مل کر بیت اللہ میں داخل ہوتے ہیں۔ چناں چہ دیکھا گیا کہ اُن سب کے تہبند آگے سے بھیگے ہوئے تھے۔ اُس وقت سب کو اس کا احساس ہوا اور عورتوں اور مردوں کو ساتھ داخل ہونے کی ممانعت ہوگئی(۱)۔

سفیان ثانیؒ پر مصایب:

اسی طرح اس سفیانِ ثانیؒ کے ہاتھوں سیکڑوں مردہ سنتیں زندہ ہوئیں، اور یہی وہ کام تھا کہ جس کو آپ نے اپنی زندگی کا مقصودِ اعظم بنایا تھا اور جس کے پورا کرنے میں آپ کو دنیوی جاہ و مال بلکہ عزت و آبرو سے بھی ہاتھ اُٹھانا پڑا۔ ہزاروں آفات اور مصایب کا سامنا ہوا۔ دوستوں اور دشمنوں کے طعنے سنے، مگر وہ کوہِ وقار تھے کہ اپنی جگہ سے ایک انچ ٹلنا نہ جانتے تھے۔ اُن کے مطمحِ نظر ارشادِ خداوندی:

وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا. (سورۂ آل عمران:۱۸۶)

”اور تم ضرور سنو گے اُن لوگوں سے جن کو تم سے پہلے کتاب ملی ہے، اور مشرکوں سے بہت ایذا کی باتیں۔“

تھا۔ وہ اُن کی ایذاؤں کو بہ رضا و رغبت سہنے کے لیے تیار تھے:

بہ یا اے عشق رسوائے جہانم کن کہ یک چندے

ملا متہائے بے درداں شنیدن آرزو دارم

گالیاں سن کر بھی متانت سے جواب:

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ آپ جامع مسجد دہلی سے اُتر رہے تھے کہ دہلی کے چند شہدوں (غنڈوں) نے آپ کو گالیاں دینی اور حرامی کہنا شروع کیا۔ اب آپ کا جواب سنیے! مسکرا کر نہایت متانت سے فرماتے ہیں کہ بھئی! میں حرامی کیوں کر ہو سکتا ہوں؟ میری والدہ کے نکاح کے گواہ تو اب تک موجود ہیں۔

پیشہ ور بدکاروں کو تبلیغ:

تبلیغ احکامِ خداوندی اور اشاعتِ سنت کا خیال ہر وقت دامن گیر تھا۔ ایک روز خیال آیا کہ دہلی میں کسبی (پیشہ ور بدکار) عورتیں بہت ہیں، ان کو کوئی وعظ و نصیحت نہیں سناتا؟ آخر یہ بھی تو آدمی ہیں، ممکن ہے کہ نصیحت کارگر ہو جائے اور ایک ساتھ سیکڑوں خدا کے بندے گناہ سے بچ جائیں۔

آخر رات کو ایک مشہور کسبی کے مکان پر جا کر دروازے پر پہنچے۔ معلوم ہوا کہ شہر کی اور بھی بہت سی کسبیاں اُس کے مکان پر موجود ہیں اور اپنے گانے بجانے میں مصروف ہیں۔ جاتے ہی گداگروں کی سی صدا دی۔ مکان کے اندر سے ایک لڑکی بھیک لے کر آئی۔ حضرت شہید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جا کر صاحب مکان سے کہہ دو کہ اس فقیر کی عادت ہے کہ جب تک اپنی صدا نہیں سنا لیتا اُس وقت تک بھیک نہیں لیتا۔ لڑکی نے جا کر کہہ دیا۔ جواب ملا کہ ہمیں صدا سننے کی ضرورت نہیں، تم فقیر ہو، تمہیں اپنی بھیک سے مطلب، اِن باتوں سے کیا غرض؟

مگر حضرت شہیدؒ کو تو غرض ہی اس سے تھی، فرمایا کہ ہم تو بدوں (بلا) صدا سنائے ہوئے بھیک نہ لیں گے۔ آخر چند مرتبہ کی ردوکد کے بعد کسبیوں نے بھی خیال کیا کہ یہ کوئی عجیب فقیر ہے، اس کی صدا بھی سن دیکھو کیا کہتا ہے۔ یہ بھی ایک تماشہ سہی۔

حضرت شہید رحمۃ اللہ علیہ اندر داخل ہوئے اور کھڑے ہو کر:

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (سورۂ والتین: ۱ تا ۴)

"قسم انجیر کی اور زیتون کی اور طور سینین کی اور اس شہر امن والے کی۔ ہم نے بنایا آدمی خوب سے خوب اندازے پر۔"

پڑھ کر وعظ شروع کر دیا۔ حضرت شہید رحمۃ اللہ علیہ کا وعظ ہے اور فاحشہ عورتوں کی مجلس۔ یہ عجیب وغریب منظر کچھ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ فواحش کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ طبلچیوں نے اپنے اپنے طبلوں اور سارنگیوں کو بغلوں سے نکال نکال کر پھینک دیا ہے۔ کوئی مصروف آہ ونالہ ہے تو کسی کو گریہ وبکا دم لینے کی اجازت نہیں دیتا۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں۔ گویا یہ لوگ دوزخ کی بھڑکتی ہوئی آگ اپنے سامنے دیکھ رہے ہیں۔

نہ معلوم کہ حضرت شہید رحمۃ اللہ علیہ نے ان سر دلوں میں وہ کون سی برقی حرارت چھوڑ دی ہے جس کی تاثیر سے معاصی کے تمام نحس (نامبارک) مادے پگھل پگھل کر آنکھوں سے بہنے لگے:

آج اُس بزم میں ہم آگ لگا کر اُٹھے
یاں تلک روے کہ اُن کو بھی رُلا کر اُٹھے

وعظ کا ختم ہونا تھا اور ساری مجلس حضرت شہید رحمۃ اللہ علیہ کے قدموں میں گر پڑی۔ اُن کی ہدایت کا وقت آ گیا تھا۔ اُسی ایک مجلس میں سب نے حضرت شہید رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر توبہ کی اور سب کے سب خدائے تعالیٰ کے مقبول بندے ہو گئے۔

صاحبِ خانہ تبلیغ کے بعد:

صاحبِ خانہ جو اُن سب میں حسن و جمال اور مال و ریاست کے اعتبار سے بڑی تھی اور اکثر روسا و نواب اُس سے مبتلا تھے، اِس سحر بیان وعظ سے اتنی متاثر ہوئی کہ اپنا سارا مال و متاع لٹا کر شب و روز عبادت میں مشغول ہو گئی، اور جب حضرت شہید رحمۃ اللہ علیہ نے سکھوں سے جنگ کی تو یہ بھی آپ کے لشکر میں تھی اور وہی ہاتھ جنہوں نے عمر بھر چکی کا ہتھ نہ دیکھا تھا آج اُن میں گھوڑوں کا دانہ دلتے دلتے (پیستے پیستے) مہندی کے بجائے آبلے پڑے ہوئے ہیں۔ وَاللّٰہُ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی سَوَآءِ السَّبِیْل!

کچھ اپنی عزت کا خیال ہے؟

مولانا اسمٰعیل صاحبؒ وعظ سے فارغ ہو کر باہر آئے۔ آپ کے ایک عزیز آپ کو فواحش کے گھر کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر آہستہ آہستہ پیچھے ہو لیے تھے اور چھپ کر دروازے میں یہ سارا ماجرا دیکھ رہے تھے۔ جب اُس کے گھر سے نکل کر چند قدم آگے بڑھے تو وہ عزیز سامنے آئے اور عرض کیا کہ حضرت! کچھ اپنی عزت کا بھی تو خیال چاہیے؟ مولانا نے فرمایا کہ

”واللہ! میری عزت تو اس وقت ہوگی کہ میرا منہ کالا کر کے مجھے گدھے پر سوار

کیا جائے اور دہلی کے چاندنی چوک میں پھرایا جائے، مگر میری زبان کسی خلافِ حق کلمے کے ساتھ ملوث نہ ہو، میری زبان پر وہی قال اللہ اور قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جاری ہو۔"

سچ ہے عزت وذلت کی حقیقت کو وہی لوگ خوب جانتے تھے:

الا رب ذل ساق النفس عزۃ
و یا رب نفس بالتذلل عزۃ

"خبردار! بہت سی ذلتیں ہیں جو نفس کے لیے عزت کا باعث ہوتی ہیں، اور بہت سے نفوس کو ذلت ہی سے عزت ملی ہے۔"

اُن کا مطمحِ نظر فرمانِ خداوندی تھا:

لِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ (سورۂ منافقون:۸)

"بے شک عزت اللہ اور اُس کے رسول اور مومنین ہی کا حصہ ہے۔"

مجھے اس وقت حضرت شہیدؒ کی سوانح عمری لکھنی مقصود نہیں، محض یہ دکھلانا ہے کہ اگرچہ زمانے میں فسق وفجور شائع اور عام ہو چکا ہے مگر با ایں ہمہ آمرین بالمعروف کی جماعت بھی کسی قرن اور کسی زمانے میں بالکل منقطع نہیں ہوئی۔

آمرین بالمعروف کے سرکردہ رہنما:

کل کی بات ہے کہ ہندوستان میں قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ سرہٗ اور قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نور اللہ مرقدہ اس جماعت کے پیشوا و امام تھے، اور آج بھی دنیا میں اُن کے خلفا اُن کے کام کو انجام دے رہے ہیں[1]۔

---

(۱) اب (۱۴۳۶ھ/۲۰۱۵ء میں) حضرت گنگوہیؒ اور حضرت نانوتویؒ کے براہ راست تلامذہ اور خلفا موجود نہیں ہیں، بلکہ ان کے خلفا کے خلفا (پڑپوتے متوسلین) کا فیض بحمد للہ جاری ہے اور ان شاء اللہ جاری رہے گا۔ (شریفی)

حضرت مولانا گنگوہی طاب اللہ ثراہ کو امراء سے ایک طبعی نفرت سی تھی۔ کیوں کہ یہ لوگ اکثر دین و مذہب میں مفلس ہوتے ہیں، جس کے مشاہدہ کرنے والے آج بھی سیکڑوں موجود ہیں۔ ہاں! اگر کسی رئیس کو متبع شریعت پاتے تو پھر وہی محبت اور تعلق رکھتے تھے جو ایک متدین مسلمان کو دوسرے متدّین (معاملات اور بات میں پکے) مسلمان کے ساتھ ہونا چاہیے، اور پھر بھی:

المؤمن مرآۃ المؤمن

''ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لیے آئینہ ہوتا ہے کہ اُس کی بھلائی بُرائی اُس کے منہ پر رکھ دیتا ہے۔''

کی شان جاری رہتی تھی۔

حضرت گنگوہیؒ اور نہی عن المنکر:

ہندوستان کے ایک نہایت باشرع اور متدین نوّاب جو حضرت مولانا گنگوہیؒ کے پیر بھائی ہوتے ہیں، آپ سے تعلق رکھتے تھے، اور حضرتؒ کو بھی اُن سے ایک خاص محبت تھی۔ ایک مرتبہ حضرت مولاناؒ کو یہ خبر ملی کہ وہ یتیموں کے مال میں احتیاط نہیں کرتے ہیں۔ اس سفیانِ وقت کو کہاں تاب تھی کہ یہ سن کر خاموش رہتے؟ فوراً اُن کو خط لکھا، جس کا مضمون یہ تھا:

''مجھے آپ سے محض اللہ کے لیے محبت اور تعلق تھا، لیکن میں آج یہ سن رہا ہوں کہ آپ یتیموں کے مال میں خیانت کرتے ہیں، جس کے متعلق ارشاد خداوندی ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ

نَارًا (سورۂ نساء:۱۰)

(جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں وہ فی الحقیقت آگ کھا رہے ہیں)

اس لیے میں آپ کو اطلاع دیتا ہوں کہ اگر یہ خبر فی الواقع صحیح ہے تو میرا آپ سے کوئی تعلق نہیں، اور اس کے بعد آپ مجھے خط لکھنے کی تکلیف نہ کریں، اور اگر آپ کو بھی مجھ سے واقع میں حب فی اللہ ہے تو میری اس تحریر کو اپنی خیر خواہی سمجھ کر اپنے فعل سے توبہ کیجیے۔ والسلام!"

صحابہ صفت حضرات:

درحقیقت اِن دونوں صحابہ صفت حضرات نے اس چودھویں صدی میں اسلام کے بہترین قرون کا تماشہ دکھلایا ہے۔ ان کے ہاں قدم قدم پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہوتا تھا۔ اُن کو احکامِ خداوندی کی اشاعت کے مقابلے میں نہ کسی عزیز اور دوست کی پرواہ تھی اور نہ جاہ و مال کا خیال۔ اسی لیے ابنائے زمانہ کی دست درازیاں جو اِن دونوں بزرگوں پر ہوئی ہیں اُن سے آج کون ہے جو واقف نہیں؟

مجھے اس وقت اِن حضرات کے بھی حالات جمع کرنے مقصود نہیں (اور نہ یہ میری وسعت میں ہے) بلکہ محض مشتے نمونہ از خروارے یہ دکھلانا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اسلام کا وہ رکن رکین ہے کہ ہر زمانے کے علمائے ربانیین نے اس کو اپنی ہستی کا مقصودِ اعظم سمجھا ہے، اور اس کے مقابلے میں تمام دنیا و مافیہا کو ایک مچھر کے پَر کے برابر بھی نہیں رکھا۔

قابلِ توجہ:

چوں کہ باوجود اِتمام تاکیدات کے انسان کو امر بالمعروف سے روکنے والی تین چیزیں ہیں:

۱......تعلقاتِ مراتب ومودت (محبت) کہ انسان اِن کے لحاظ میں دب کر حق گوئی سے رُک جاتا ہے۔

۲......جاہ ومال کی طمع یا کسی ظالم کے قہر کا خوف کہ انسان کے لیے امر بالمعروف سے مانع ہوتا ہے۔

۳......کسی کے علم وفضل اور تحریر وتقریر کا رعب یا زیادتیِ عمر کا لحاظ بھی انسان کے لبوں پر مہر سکوت لگا دیتا ہے۔

اس لیے، میں نے اپنی تحریر کے تین حصے کیے ہیں:

پہلا امر کے بیان میں کہ مسلمان کو امر بالمعروف کے مقابلے میں تعلقات کی رعایت کہاں تک مناسب ہے؟

دوسرے اس بیان میں کہ آمرین بالمعروف کو ظالم کے خوف کے وقت کیا کرنا چاہیے؟ اور جاہ ومال کی رعایت امر بالمعروف کے مقابلے میں کہاں تک کی جاسکتی ہے؟ اور سلف صالح کا ایسے اوقات میں کیا دستور العمل رہا ہے؟

تیسرے اس امر کے بیان میں ہے کہ امر بالمعروف کے مقابلے میں کسی کے علم ودانش اور فصاحت وبلاغت یا معمر ہونے کی رعایت کس حد تک کی جاسکتی ہے؟

اور تینوں امور کے ثابت کرنے کے لیے (بلکہ مذہب کے ہر مسئلے اور ہر حکم کے اثبات کے لیے) میرے خیال میں تعامل سلف سے بڑھ کر کوئی دلیل نہیں۔ اس لیے میری تحریر کے تینوں حصے ان شاء اللہ تعالیٰ علمائے سلف کے واقعات اور صلحائے خلف

کے حالات سے بھرے ہوئے ہوں گے، تاکہ ہم جیسے مداہن اور دین میں سستی برتنے والے مسلمان اپنے سلف کے حالات پڑھ کر کچھ تو اپنی حالت پر شرمائیں، اور اُن کے نشانِ قدم پر اگر دوڑ کر نہیں تو بچوں کی طرح گھٹنیوں تو چلنا شروع کر دیں، اور ہمیں اپنے دین و اسلام کی حقیقت معلوم ہو جائے، جس پر ہمارے اعضاو جوارح زبانِ حال سے کہتے ہیں:۔

ہر گزم باور نمے آید زروے اعتقاد
ایں ہمہ ہا کردن و دینِ پیمبر داشتن

جن میں سے بحمد اللہ تعالیٰ پہلے امر کے اثبات میں ایک حد تک کامیاب ہو چکا ہوں، اور سلف و خلف کے تھوڑے سے واقعات اِس حصے میں ہدیۂ ناظرین کر کے تطویل کے خوف سے اس کو اسی پر ختم کرتے ہوئے دوسرا حصہ شروع کرتا ہوں۔ وما توفیقی الا باللہ رب العلمین!

ساتواں باب

امراوسلاطین کوامر بالمعروف اور علماے سلف

رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا فرمان ہے:

افضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر

''افضل جہاد ظالم بادشاہ کے سامنے حق کہنا ہے۔''

اور ارشاد ہوتا ہے:

لا يمنعن احدا منكم هيبة الناس ان يقول بحق اذا علمه (رواہ الترمذی)

''تم میں سے کسی کو لوگوں کی ہیبت اور خوف حق گوئی سے مانع نہ ہونا چاہیے، جب کہ وہ اُس حق کو پہچانتا ہو۔''

اِس فرمانِ نبوت سے ثابت ہوگیا کہ جس طرح ایک عام مسلمان اگر مبتلاے منکرات دیکھا جائے تو ہر مسلمان کو حق ہے کہ اُس کو امر بالمعروف کرے۔ اسی طرح ایک مقتدر بادشاہ بھی اگر مبتلا ہو تو ہر ایک مسلمان اُس کو امر بالمعروف کرسکتا ہے۔

عوام اور امرا میں امر بالمعروف کے طریقے میں فرق:

ہاں طریقۂ امر بالمعروف میں کسی قدر فرق ضرور ہے۔ کیوں کہ عوام کے امر بالمعروف کرنے میں چند درجات ہیں اول یہ کہ اُس کو حکم شرعی بتلا کر آگاہ کردے

کہ تمہارا یہ فعل اس حکمِ شرعی کے خلاف ہے۔ اب اگر اتنی بات کارگر نہ ہو تو کچھ پند و نصیحت اور وعظ نرم لہجے میں سمجھائے، اور اگر اس سے بھی متاثر نہ ہو تو پھر سختی سے سمجھائے، اور اگر اب بھی اُس کا نشہ نہ اُترے تو پھر بہ شرطِ قوت ہاتھ سے کام لے، اور اُس کو اپنے فعل سے باز آنے پر مجبور و مضطر کرے۔

اور امرا و سلاطین کو امر بالمعروف کرنے میں صرف اول کے دو درجے استعمال کیے جاسکتے ہیں، یعنی اول اُن کو مسئلہ بتلا دیا جائے، اور اگر یہ نافع نہ ہو تو پھر وعظ و نصیحت سے کام لے، سختی سے سمجھانا اور مقابلے کی ٹھاننا مناسب نہیں، کیوں کہ اس صورت میں فتنہ اور فساد کے عام ہو جانے کا اندیشہ قوی ہے، جس کی شریعت غرا کسی وقت اجازت نہیں دیتی۔ کیوں کہ اب اگر ایک منکر میں مبتلا تھے تو فتنے کے وقت ہزاروں منکرات میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اسی لیے نبی کریم علی الصلوٰۃ والتسلیم نے ایسے مواقع کے لیے نہایت تاکید کے ساتھ ارشاد فرمایا ہے کہ سکوت بہتر ہے۔ چناں چہ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

ان النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم قال کیف بك اذا اُلقیت فی حثالة من الناس مرجت عهودهم واماناتهم واختلفوا فکانوا هکذا و شبك بین اصابعه قال فبم تأمرنی قال علیك بما تعرف ودع ما تنکر و علیك بخاصة نفسك وایاك وعوامهم وفی روایة الزم بیتك واملك علیك لسانك وخذ ما تعرف ودع ما تنکر وعلیك او بامر خاصة نفسك ودع امر العامة.

(رواہ الترمذی و صححہ)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اے عبداللہ! تم اُس وقت کیا کروگے جب تم بے کار و بے ہودہ لوگوں میں رہ جاؤ گے؟ جن کے عہود اور امانات فاسد ہو چکے ہوں گے اور وہ آپس میں اختلاف کرتے کرتے ایسے ہوگئے ہوں گے (یہ کہہ کر آپ نے اپنی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر دکھائیں)۔ حضرت عبداللہؓ نے کہا: فرمایئے! آپ اس وقت کے لیے کیا امر فرماتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ اُن سے اچھی باتیں لے لو اور بُری چیزیں چھوڑ دو، اور تم اُس وقت اپنے نفس کی حفاظت کو لازم جانو کہ کہیں تم بھی مبتلا نہ ہو جاؤ، اور عوام کو امر بالمعروف کرنے کا خیال چھوڑ دو، اور ایک روایت میں ہے کہ اپنے گھر کے گوشے میں پڑے رہو، اور اپنی زبان کو اپنے قابو سے باہر نہ ہونے دو، اور اچھی باتیں لے لو اور بُری باتیں چھوڑ دو، اور فقط اپنے نفس کی حفاظت لازم سمجھو۔ لوگوں کے معاملے کو چھوڑ دو۔''

اور اسی مضمون پر امام بخاریؒ اپنی کتاب ''صحیح'' میں حضرت عبیداللہ ابن عدی ابن خیارؒ سے روایت کرتے ہیں:

''جب ذی النورین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ گھر کے اندر محصور تھے اور نماز پنج گانہ میں امامت وہی لوگ کرتے تھے جو اُس فتنے اور شورش کے محرک تھے، تو حضرت عبیداللہ ابن عدیؒ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اے امیر المومنین! لوگوں کے امام حق آپ ہیں، اور جو مصایب آپ پر ہیں وہ آپ دیکھ رہے ہیں، اور ہمیں اب امام فتنہ نماز پڑھاتا ہے، جس کی وجہ سے ہم بہت تنگی میں ہیں۔ حضرت ذی النورین

رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر فرمایا کہ نماز تمام اعمال میں سے احسن ہے، تو جب تک لوگ اس کو اچھی طرح پڑھتے رہیں تو تم اُن کے ساتھ شریک رہو، اور جب وہ اُس کو کما حقہ ادا نہ کریں تو تم اُن کا ساتھ چھوڑ دو۔"

(ہذا مضمون ما رواہ البخاری من غیر لفظ)

اس میں حضرت ذی النورین رضی اللہ عنہ نے حضرت عبید اللہؓ کو بھی وصیت فرمائی کہ تم خود اپنے نفس کو اُن کی برائی سے بچالو، اور اسی مضمون میں سب سے زیادہ صریح روایت ابوداود میں ہے:

عن قبیصة ابن وقاص قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم یکون علیکم امراء مِن بعدی یؤخرون الصلوٰة فھی لکم وھی علیھم فصلوا معھم ماصلوا القبلة.

(رواہ ابوداؤد)

"حضرت قبیصہ ابن وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ میرے بعد تم پر ایسے بادشاہ ہوں گے جو نماز کو اپنے وقت مستحب سے مؤخر کریں گے، مگر یہ تاخیر تمہارے حق میں مفید اور اُن کے حق میں مضر ہوگی (کیوں کہ تم بہ وجہ عدم استطاعت کے معذور ہوگے) سو تم انہیں کے ساتھ نماز پڑھتے رہو، جب تک کہ وہ قبلے کی طرف نماز پڑھیں۔"

امراء سے سختی سے پیش آنے پر عظیم فتنے کا خطرہ:

اس سے بالکل صاف واضح ہوگیا کہ جب یہ یقین ہوجائے کہ سلاطین پر ہماری پند و نصیحت کارگر نہ ہوگی تو سکوت اولیٰ ہے۔ سختی اور درشتی یا جنگ و جدال اُس وقت

تک مناسب نہیں جب تک کہ وہ دائرۂ اسلام میں باقی ہے۔ اسی لیے علمائے سلف اور اساطینِ امت میں اس کی نظیریں موجود ہیں کہ وہ سلاطین اور امرا کے منکرات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ دیکھ کر لہو کے گھونٹ پیتے رہے، مگر اس ارشادِ نبوی کو اپنا امام بنا کر لبوں پر مہرِ سکوت لگائے رہے۔

حاصل یہ ہے کہ امرا و سلاطین کے ساتھ سختی سے پیش آنے میں چوں کہ ایسے فتنوں کا خیال ہے جو ہزاروں منکرات کو اپنے اندر لیے ہوتے ہیں، اس لیے عقل کی بات نہیں کہ ایک منکر کو اُٹھانے کے لیے ہزاروں منکرات میں مبتلا ہو کر عرب کی مشہور ضرب المثل:

فر من المطر و وقع تحت المیزاب

"بارش سے بھاگ کر پرنالے کے نیچے جا پڑا"۔

کے مصداق بنیں۔ ہاں اگر اس کو قرائنِ حال یہ ثابت کر دیں کہ اس کی سختی کا اثر صرف اسی کی ذات تک محدود رہ کر کسی عام فتنے کو نہ جگائے گا اور دوسرے مسلمان اس کی وجہ سے مبتلائے مصایب نہ ہوں گے تو پھر مستحب ہے کہ اگر ہمت رکھے تو جان پیدا کرنے والے کی راہ میں جان نذر کر دے:

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اور اسی لیے جہالِ اُمت اور سلفِ صالحین میں اُن عشاقِ رسول اور سنت پر مر مٹنے والوں کی تعداد بھی حصر اور گنتی سے باہر ہے جنھوں نے سنت سید المرسلین (صلی اللہ علیہ وسلم) کے احیا میں قدم قدم پر سرفروشیاں کی ہیں۔ منکرات اور معاصی کی نجاسات کو اپنے اُس بیش قیمت خون سے دھویا ہے جس کے ایک قطرے کا وزن تمام عالم کے

خون سے کہیں زاید ہے۔ دیوارِ مذہب کے رخنوں اور دراڑوں کو اپنے اُن قیمتی سروں سے بھرا ہے کہ تمام دنیا کے سر اُن میں سے ایک کی بھی مکافات نہیں کر سکتے۔ اُن کے خون تاریخی دنیا کے اُفق پر آج تک ایک ہیبت ناک صورت میں چمکتے اور آدمی کا کلیجہ رکھنے والوں کو خون (کے آنسو) رُلاتے ہیں، جن میں سے مشتے نمونہ از خروارے کچھ واقعات ہدیہ ناظرین کیے جاتے ہیں۔

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ اور ظالم الامت حجاج ابن یوسف:

واقعہ لکھنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اصحاب واقعہ کی مختصر تعریف سے ناظرین کو مطلع کر دیا جائے، تا کہ وہ واقعے کی عظمت کا صحیح اندازہ کر سکیں۔ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما وہی حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے صاحب زادے اور جلیل القدر صحابی ہیں جن کے کچھ حالات آپ اسی مضمون کے ذیل میں دیکھ آئے ہیں، اور در حقیقت کسی شخص کی نسبت یہ معلوم کر لینے کے بعد کہ وہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شرف صحبت رکھتے ہیں اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے شرف نسبت، اس کی حاجت نہیں کہ پھر اُن کی کوئی اور تعریف تلاش کی جائے۔ کیوں کہ ان میں سے صحابیت کا ایک وصف ہی ایسا جامع وصف ہے کہ تمام دنیا کے کمالات کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ خصوصاً جب کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا صاحب زادہ ہونا بھی سونے پر سہاگہ ہو جائے، وہ اسی جمال کی تفصیل ہوگی۔

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما اپنے والد حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے ساتھ مکہ معظمہ میں مسلمان ہوئے، اور ابھی تک بالغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ آپ اُن زہاد صحابہ میں سے ہیں کہ مورخین لکھتے ہیں کہ آپ نے تعمیر کے نام سے کبھی اینٹ پر اینٹ نہیں رکھی۔ عمر کا ایک طویل حصہ تجرد (بلا نکاح)

میں گزار دیا۔ دن کو روزہ رکھتے اور رات کو اپنے مالک بے نیاز کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونے کے سوا کوئی کام نہ تھا۔

حضرت نافع رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جب آیت کریمہ:

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

(سورۂ حدید:۱۶)

''کیا مومنین کے لیے اب تک اس کا وقت نہیں آیا کہ اُن کے دل اللہ کے ذکر کے لیے خاشع ہو جائیں؟''

پڑھتے تو روتے روتے آپ پر غشی طاری ہو جاتی تھی۔ (اسد الغابہ: ج۳،ص۲۲۹)

نکاح سے پہلے آپ کے اوقات مسجد ہی میں گذرتے تھے۔ لیٹنا بیٹھنا بھی اکثر مسجد ہی میں تھا، مگر بہ ایں ہمہ مسجد کا ادب اتنا ملحوظ تھا کہ جب مسجد کو جانے کا ارادہ فرماتے تو نہایت مودب اور آہستہ چلتے تھے۔

حضرت ابن عمرؓ کا زہد:

زہد کا یہ حال تھا کہ ایک شخص نے آپ کی خدمت میں جوارش ہدیتاً پیش کی۔ آپ نے فرمایا کہ یہ کیا ہے اور اس کا کیا فایدہ ہے؟ ہدیہ پیش کرنے والے نے عرض کیا کہ حضرت! کھانا کھانے کے بعد اس میں سے کچھ تناول فرما لیا کیجیے، ہضم کے لیے نافع ہے۔ فرمایا کہ بھئی! مجھے پیٹ بھر کر کھانے کی نوبت ہی نہیں آتی کہ جوارش کی ضرورت ہو۔ (طبقات ابن سعد: ج۴،ص۱۱۰)

اور اس تنگی پر استغنا کا یہ حال کہ ایک مرتبہ عبد العزیز ابن ہارونؒ نے آپ کی خدمت میں ایک عریضہ لکھا، جس کا مضمون یہ تھا کہ اگر آپ کو کوئی حاجت ہو تو بے تکلف بیان فرمائیے، تاکہ میں اس کو پورا کر کے اپنے لیے ذریعۂ نجات تصور کروں۔

آپ نے جواب میں ایک حدیث تحریر فرمائی جس کا ترجمہ یہ ہے:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرماتے تھے کہ خیرات کو اپنے عزیزوں اور رشتے داروں سے شروع کرنا چاہیے، اور اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے۔''

اور تحریر فرمادیا کہ میرے خیال میں اوپر کا ہاتھ دینے والا ہاتھ ہے اور نیچے کا ہاتھ لینے والا، اس لیے میں نہیں چاہتا کہ اپنے ہاتھ کو ید سافلہ (نیچے کا ہاتھ) بناؤں۔

حضرت ابن عمرؓ کا اتباع سنت:

صحابہؓ کی اُس مکرم و محترم جماعت میں جس کا ہر ہر فرد نہ صرف متبع سنت تھا بلکہ اُس کے لیے سنت ہی وہ چیز تھی جس کو وہ تمام دنیا کے مرغوبات اور عیش و آرام پر ترجیح دے کر اُس پر سو جان سے قربان ہونے کے لیے آمادہ و تیار نظر آتا تھا۔ اُن میں بھی آپ اتباع سنت میں ضرب المثل تھے۔ کیوں کہ آپ سیرت نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے اتباع کے ساتھ صورت کے اتباع کا بھی ہر قدم پر لحاظ رکھتے تھے۔

سفر میں اس کا بڑا خیال رہتا تھا کہ جس جگہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے منزل فرمائی تھی اُسی جگہ منزل کی جاے، اور پھر اسی پر اکتفا نہیں بلکہ اُس منزل میں جس جگہ جو کام آپ نے کیا ہے حتی الامکان یہ کوشش تھی کہ وہ کام وہیں ادا کیا جاے۔

مشہور ہے کہ جس جگہ آپ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پیشاب کرتے ہوے دیکھا تھا جب اُس جگہ پر پہنچتے تو وہاں اُترتے، اور اُس وقت آپ کو اگر حاجت بھی نہ ہوتی تو پیشاب کرنے کی صورت بنا کر بیٹھ جاتے تھے۔

اسی لیے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے ہر ہر فعل پر لوگوں کی نظریں لگی رہتی

تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ آپ اگر کسی عذر سے کوئی ایسا فعل کرتے جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں تو لوگوں کو مطلع فرما دیتے تھے، تا کہ لوگ اُس کو سنت نہ سمجھ بیٹھیں۔ کیوں کہ آپ جس وقت جو کچھ کرتے تھے وہ درحقیقت نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا فعل ہوتا تھا۔

ایک روز کا واقعہ ہے کہ آپ حج سے فارغ ہونے کے بعد مروہ (پہاڑ) پر بال کٹوا رہے تھے، جب سر کے بالوں سے فارغ ہو چکے تو آپ نے حجام کو ارشاد فرمایا کہ سینے کے بال بھی صاف کر دے۔ لوگوں نے چار طرف سے نظریں اُٹھا اُٹھا کر دیکھنا شروع کیا۔ آپ نے درمیان ہی میں کھڑے ہو کر بہ آواز بلند فرما دیا:

> ''اے عزیزو! سینے کے بال صاف کرانا کوئی سنت نہیں جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو، مگر چوں کہ میرے بدن پر بال بہت زیادہ ہیں اور مجھے تیل وغیرہ کی مالش کی نوبت نہیں آتی، اس لیے مجھے اُن سے تکلیف ہوتی ہے، اس سبب سے میں نے ان بالوں کو صاف کرا دیا ہے۔'' (طبقات ابن سعد: ج ۴، ص ۱۱۴)

آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ نیکی تو بہت آسان چیز ہے، لوگوں کے ساتھ خندہ پیشانی سے رہنا اور نرم کلام کرنا، پھر لوگ اُس سے کیوں غافل ہیں؟ (اسد الغابہ)

حجاج ابن یوسف ثقفی:

اس مختصر کلام سے ہمارے ناظرین کو حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی جلالت قدر کا تو کچھ اندازہ ہو چکا ہے۔ اب چند سطور حجاج ظالم کے حالات میں سے بھی درج کی جاتی ہیں، تا کہ اس کے بعد واقعات پر بہ خوبی روشنی پڑ سکے۔

یہ شخص بھی زمانے کے اُن عجایب میں سے جن میں عقلیں حیران ہوتی ہیں اور تھک کر رہ جاتی ہیں، اپنے سن وسال کے اعتبار سے تابع ہے(۱) بڑے بڑے اجلہ صحابہؓ اس کے زمانے میں موجود ہیں، مگر ہدایت وضلالت خداوند عالم کے سوا کسی کے ہاتھ میں نہیں۔ کیا حیرت کے قابل نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب کفر پر مرے اور حضرت بلال حبشہ سے، حضرت سلمان فارس سے، حضرت صہیب روم سے آکر اسلام کے ارکان بن جائیں؟ رضی اللہ عنہم: ۔

حسن زبصرہ بلال از حبش صہیب از روم
زخاک مکہ ابوجہل ایں چہ بوالعجی است

حجاج بہ ایں ہمہ سامان رشد وہدایت اگر شقی وبد بخت رہے تو کیا تعجب ہے؟

حضرت عمر ابن عبد العزیزؒ فرماتے ہیں کہ اگر تمام امم سابقہ اپنے اپنے خبیث اور شریر لوگوں کو لاکر جمع کر دیں اور ہم ان سب کے مقابلے میں صرف حجاج کو پیش کر دیں تو یقیناً ہمارا پلّہ بھاری رہے گا۔ (تاریخ ابن الاثیر: ج۴، ص۲۲۴)

حضرت عمر ابن عبد العزیزؒ کے بعد بعض اکابر نے اس میں اتنا اور اضافہ فرمایا ہے کہ اسی طرح اگر تمام امم سابقہ اپنے اپنے عادلین اور منصفین کو جمع کرلائیں اور ہم سب کے مقابلے میں فقط عمر ابن عبد العزیز کو پیش کر دیں تو بے شک ہمارا پلہ جھک جائے گا۔ (تاریخ ابن الاثیر: ج۴، ص۲۲۳)

اور واقع میں جس طرح حجاج نے اپنے زمانے میں زمین کو ظلم وجور سے بھرا ہے وہ عالم (دنیا) میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ یہی نہیں کہ لاکھوں بندگانِ خدا کو تہ تیغ کر دیا بلکہ

---

(۱) اس عبارت میں یہ جملے ''اپنے سن وسال کے اعتبار سے ''تابعی ہے'' اس طرح ہونا چاہیے تھے: ''اپنے سن وسال کے اعتبار سے تابعی ہونا چاہیے تھا۔'' اس لیے کہ تابعی ہونے کے جو شرائط ہیں وہ جس طرح یزید میں نہیں پائی جاتیں اسی طرح حجاج میں بھی نہیں ہیں۔ (شریفی)

چُن چُن کر اُن مبارک اور مقدس سروں پر شمشیر آزمائی کی ہے جس کے وجود پر اسلام اور اہل اسلام کو ناز تھا۔ حضرت عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہا جیسے جلیل القدر صحابی اُسی کے ہاتھوں شہید ہوے۔ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما جیسے رکن اسلام اُسی کی سازش سے شہید کیے گئے۔ حضرت سعید ابن جبیرؒ جیسے حبر اُمت اُسی کے ظلم وجور کے شہید ہیں۔

بیان کیا جاتا ہے کہ جن لوگوں کو حجاج نے بے گناہ قتل کیا اُن کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار تک پہنچی ہے، جن میں سے ایک لاکھ کا تو وہ خود بھی مقرر تھا، بلکہ ایک مرتبہ عبدالملک ابن مروان کے سامنے اقرار کیا کہ جب شیطان مجھے دیکھتا ہے تو میری موافقت کرتا ہے۔ درحقیقت وہ خداوند عالم کا ایک قہر تھا جو انسان کی شکل میں تشکل ہوکر لوگوں پر مسلط ہوا تھا۔

حضرت علیؓ کی بددعا کی شکل حجاج کی صورت میں:

چناں چہ ابن اثیر اپنی تاریخ میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے نقل فرماتے ہیں کہ جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ لوگوں کا نزاع بڑھ گیا اور انہوں نے آپ کو زیادہ تنگ کرنا شروع کیا تو ایک مرتبہ آپ نے منبر پر کھڑے ہوکر ایک خطبہ پڑھا، جس کے آخر میں یہ دعا فرمائی:

> ''اے اللہ! میں نے لوگوں کے ساتھ امانت داری کی اور انہوں نے میرے ساتھ خیانت۔ میں نے اُن کی خیرخواہی کی اور انہوں نے مجھ پر ظلم ڈھاے۔ اے اللہ! ان پر بنی ثقیف کا ایک شخص مسلط کردے جو اُن کے جان و مال میں ظلم کرے اور اُن میں زمانۂ جاہلیت کے احکام جاری

کرے۔" (تاریخ ابن الاثیر: ج۴، ص۲۲۳)

مظلوم کی دعا اور مظلوم بھی کون؟ حضرت علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ۔ کیسے ممکن تھا کہ تیر بہدف نہ ہوتی؟ آپ کی بددعا حجاج کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ اس خون خوار گورنر کے حالات پر نظر ڈالو اور پھر اندازہ کرو کہ لوگوں پر اُس کا کیا کچھ رعب ہونا چاہیے؟ اور خیال کرو کہ اُس کے سامنے کوئی حرف مخالف زبان سے نکالنا کس دل گردے کا کام ہے؟ اور پھر عشاق رسول اور دل دادگان سنت کے وہ دلیرانہ مکالمات سنو جو اُن کے اور حجاج کے درمیان ہوے ہیں، تاکہ آپ معلوم کرسکیں کہ حب رسول اللہ اور عشق سنت کس کو کہتے ہیں۔

حب رسول اور عشق رسول کا تعین:

عادت اللہ جاری ہے کہ اپنی تمام مخلوقات میں ہر بُری چیز میں کوئی اچھا وصف رکھ دیتا ہے اور ہر اچھی چیز میں کوئی برائی۔ کائنات عالم کا مشاہدہ اور اُن کے حالات کا تجربہ شاہد ہے کہ جس طرح دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں جس میں ایک وصف بھی اچھا نہ ہو، اسی طرح ایسی بھی کوئی شے نہیں جس کا وجود تمام رذائل وخبایث ہی کا مجموعہ ہو، ایک وصف بھی اُس میں قابل مدح نہ ہو۔

اسی عام عادت کے موافق حجاج بھی باوجود ان اخلاق ذمیمہ وخبیثہ کے فصاحت و بلاغت میں وہ کمال رکھتا تھا کہ ابن العلاء لغوی کہتا ہے کہ میں نے حجاج سے زیادہ فصیح و بلیغ نہیں دیکھا۔

حجاج کو چوں کہ فصاحت وبلاغت میں کمال تھا اس لیے تقریر کا شوق تھا، اور جب کسی خطبے (تقریر) کے لیے کھڑا ہوتا تو (جیسے مقررین کی عادت ہوتی ہے) اطناب و

اسباب (طویل کام) سے کام لے کر بہت سا وقت لگا دیتا تھا۔ جمعہ کے خطبے میں بھی یہی حال تھا کہ اس کو اتنا طویل کھینچتا کہ وقت ختم ہو جانے کا خوف ہو جاتا تھا[۱]۔ لوگوں کے دلوں پر اُس کی ان حرکات سے کیا گزرتی تھی؟ اس کا جواب وہی شخص دے سکتا ہے جو اُن کے تدین اور اتباع سنت پر مٹنے کے حال سے واقف ہو، اور اُس زمانے کے عوام وخواص کے حالات کا تجربہ رکھتا ہو۔

میرے خیال میں یہ بات بلا مبالغہ صحیح ہے کہ اُن کو اس منکر کے دیکھتے رہنے کا صدمہ اس سے زیادہ ہوتا ہوگا جو ہمیں اپنے سامنے اپنی جان و مال اور اہل وعیال کو تباہ و برباد ہوتے ہوئے دیکھنے سے ہوتا ہے، لیکن پھر اُس مقدس مجمع میں دو قسم کے لوگ تھے، ایک تو وہ جنہوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان[۲]:

فصلوا معهم ما صلوا القبلة

''تم اُن کے ساتھ اُس وقت تک نماز پڑھتے رہو جب تک کہ وہ قبلے کی طرف پڑھتے رہیں۔''

کو فریضۂ وقت سمجھ کر ان تمام مصایب پر صبر کیا اور یہ زہریلے گھونٹ پی پی کر بیٹھ رہے، زبان اور ہاتھ کو قابو سے باہر نہ ہونے دیا، اور دوسرے وہ لوگ تھے جو اگرچہ اس سکوت کو بھی جائز سمجھتے تھے لیکن نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے فرمان:

افضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر

''بہترین جہاد وہ کلمۂ حق ہے جو ظالم بادشاہ کے سامنے کہا جائے۔''

اپنے لیے مزید ثواب اور رفع درجات کا ذریعہ سمجھ کر حیات مستعار کو مراتب

---

(۱) فی زماننا اہل بدعت بھی جمعہ اتنی تاخیر کر کے پڑھتے ہیں کہ سردیوں میں تو مثل اول تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ اثر حجاج سے آیا ہے۔ علمائے دیوبند سے تعلق کا دعوا کرنے والے بعض ائمہ بھی اس بدعت میں مبتلا ہیں۔ (شریفی)

(۲) یہ پوری حدیث آپ اس سے چند صفحے پڑھ آئے ہیں۔ (شفیع)

اُخروی پر قربان کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے۔

ہمارے مقصود بالذکر حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما بھی اسی جماعت کے ارکان میں سے ہیں، اسی لیے کئی مرتبہ حجاج کے ساتھ آپ کو سخت مکالموں کی نوبت آئی، اور آخر ایک روز اسی پر جاں نثاری کر کے دار فانی کو خیر باد کہا۔

ایک مرتبہ تو اسی خطبۂ جمعہ کی تطویل پر تیز کلامی کی نوبت پہنچ گئی، اور خطبے کے درمیان ہی میں اُٹھ کر جو مُنہ میں آیا کہا، جس کو ابن سعدؒ نے طبقات میں اس طرح روایت کیا ہے کہ

> ''ایک روز حجاج نے خطبے کو طول دینا شروع کیا۔ حُضّار مسجد (مسجد میں موجود لوگوں) میں حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما بھی تھے۔ کچھ دیر تک تو صبر کرتے رہے، لیکن جب دیکھا کہ یہ طومار ابھی ختم ہونے والا نہیں، غصے میں آ کر کھڑے ہو گئے اور کسی قدر سختی کے لہجے میں بہ آواز بلند پکار اُٹھے: اے حجاج! خطبہ مختصر کر، وقت تنگ ہوا جاتا ہے۔''

حجاج ان تیز اور سخت آوازوں کے سننے کا کب عادی تھا؟ یہ سن کر بھنّا گیا، مگر چوں کہ کہنے والے بھی کوئی معمولی آدمی نہ تھے بلکہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے صاحب زادے ''عبداللہ'' تھے، جن کے ایک سر کے ساتھ ہزاروں سر لگے ہوئے تھے۔ غصے کو ضبط کیا اور ذرا تیزی کے ساتھ یہ کہہ کر کہ ابھی بیٹھ جاؤ، پھر خطبہ شروع کر دیا۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اس خیال سے کہ اب خطبہ مختصر کر دیا جائے گا، بیٹھ گئے۔

حجاج ان باتوں سے کب پسیجتا تھا؟ پھر وہی اسہاب و اطناب اور رعد و برق شروع کر دیا۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد کھڑے ہوئے اور پہلے سے زیادہ سخت لہجے میں: ''اے حجاج! وقت تنگ ہو گیا۔ اب اس بکواس [1] کو ختم کر اور نماز کی خبر لے''۔

حجاج یہ سن کر اگرچہ غصے میں آگ ہو چکا ہے، لیکن اب بھی ضبط کیا اور سختی کے ساتھ بٹھلانے کے سوا اور کوئی حرف زبان سے نہیں نکالا، اور پھر وہی طوفان شروع کر دیا۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما پھر بیٹھ گئے، اور اسی طرح چار مرتبہ اُٹھے اور بٹھا دیے گئے۔ چوتھی مرتبہ میں کچھ دیر انتظار کے بعد لوگوں سے کہا کہ اس مرتبہ جب میں اُٹھوں تو تم بھی میرے ساتھ اُٹھو گے؟ لوگ خود اس کے منتظر تھے۔ سب نے بہ دل و جان قبول کیا اور حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کھڑے ہو کر نہایت سختی کے لہجے میں فرمایا: ''اے حجاج! آفتاب تیرا انتظار نہیں کرے گا، اس بکواس کو چھوڑ کر پہلے نماز ادا کر، اُس کے بعد جو چاہنا بکتے رہنا''۔

حجاج نہایت طیش میں آ کر: ''کیا تمہارا یہ ارادہ ہے کہ میں تمہارے سر اور بدن کے علائق قطع کر دوں؟''

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما (نے فرمایا): ''اگر تو ایسا کرے گا تو تو ایک بیوقوف ہے کہ غصے کے ہاتھوں اپنی عاقبت خراب کرتا ہے، اور قریب خداوند قہار تجھ سے اس کا انتقام لے گا'' (اسد الغابہ)

حجاج اگرچہ غصے سے بے تاب ہے مگر ساتھ ہی اُن ہزاروں بے دام و درم لشکریوں کا خطرہ جو حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے پیچھے کھڑے ہیں اور منتظر ہیں کہ اب اپنے سروں کو آپ کے قدموں پر قربان کر دیں، حجاج کا ہاتھ اُٹھنے سے رُکا ہوا ہے

---

(۱) چوں کہ یہ خطبہ خطبۂ مسنونہ کے خلاف لفاظیوں اور تکبر آمیز کلاموں سے بھرا ہوا ہوتا تھا حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اس لیے اس کو بکواس فرما دیا ہے۔ (شریفی)

اور اُس کی تلوار کو میان سے باہر نہیں ہونے دیتا۔ آخر خطبے کو چھوڑ کر نماز ادا کی اور لوگ اپنے اپنے گھروں کو رخصت ہو گئے۔

یہ واقعہ تو جس طرح ہوا گزر گیا، مگر حجاج کے دل میں اس وقت سے حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی طرف سے ایک سخت کینہ بھرا ہوا ہے اور وہ موقع کا منتظر ہے۔

اول تو حجاج جیسے ظالم کے لیے یہی واقعہ کچھ کم نہ تھا، اُس پر طرہ یہ ہو گیا کہ جب حجاج مخذول حضرت عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہما کو شہید کر چکا تو منبر پر چڑھ کر ایک خطبہ پڑھا اور شہید مرحوم پر تبرا کرنا اور برا بھلا کہنا شروع کیا، جس میں بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچ گیا کہ اُن کے دامن تقدس کو تحریفِ قرآن کے بہتان سے آلودہ کرنے لگا[1]۔

لوگوں کے قلوب حضرت عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہما کی وفات اور بے رحمی کے

---

(۱) حضرت عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہما وہ جلیل القدر صحابی ہیں کہ صفحۂ ہستی پر آنے کے بعد پہلی وہ غذا جو آپ کے پیٹ میں گئی ہے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا ریق (لعاب) مبارک تھا۔ امام ترمذیؒ روایت کرتے ہیں کہ جس روز حضرت عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہما بطن مادر سے دایہ کی گود میں آنے والے تھے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے والد حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے گھر میں خلاف عادت (کیوں کہ انہیں وسعت کہاں تھی کہ روز مرہ چراغ روشن کیا کریں) چراغ جلتے ہوئے دیکھ کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ زبیر کے لڑکا پیدا ہوا ہے۔ تم اُن سے کہہ دو کہ اُس کا نام میں رکھوں گا، ابھی کوئی نام تجویز نہ کریں۔ پھر آپ خود تشریف لے گئے اور "عبداللہ" نام تجویز کیا، اور ایک چھوارا لے کر اپنے دست مبارک سے اُن کی تحسنیک فرمائی (تحسنیک اُس کو کہتے ہیں کہ چھوارے کو دانت سے چبا کر بچے کے تالو لگا دیا جائے)۔ عرب کی عادت تھی کہ بچوں کی تحسنیک کرتے تھے۔ (لیکن اب جاہل ڈاکٹر منع کرتے ہیں اور ہم بھی ڈاکٹروں کی بات یں آ کر سنتا چھوڑ دیتے ہیں۔ (شرقی)

یہ مقدس وجود بھی حجاج مخذول کے ہاتھوں پردۂ عدم میں روپوش ہوا ہے، اور ظالم نے اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ قتل کر کے دفن کر دیا جاتا بلکہ قتل کے بعد آپ کو کئی روز تک سولی پر لٹکا رہنے دیا۔ آپ کی والدہ ماجدہ نے (جو بڑھاپے کی وجہ سے نابینا ہو چکی تھیں) جب یہ حال دیکھا تو ایک روز حجاج کے پاس تشریف لے گئیں اور کہا کہ اے ظالم! کیا اب بھی اس سوار کے سواری سے اُترنے کا وقت نہیں آیا؟ حجاج نے کہا کہ وہ تو ایک منافق تھا۔ آپ کی والدہ نے فرمایا کہ وہ منافق نہ تھے، وہ تو بہت نماز پڑھنے والے اور روزہ رکھنے والے آدمی تھے۔ حجاج نے اُن کو جھڑک کر کہا: "اے بڑھیا! تو سٹھیا گئی ہے۔ تیرے حواس درست نہیں، جا اپنی جان کی خیر منا"۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی والدہ نے نہایت جرأت و بے باکی سے جواب دیا کہ واللہ! میرے حواس بالکل درست ہیں۔ ہاں! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ بنی ثقیف میں ایک جھوٹا پیدا ہوگا اور ایک ظالم مفسد۔ سو ہم کذاب تو پہلے دیکھ چکے (یعنی مختار ابن ابی عبید)، اب ظالم مفسد باقی تھا، جس کا ٹھیک مصداق تو ہے۔ (اسد الغابہ: ج ۳، ص ۱۶۴)

(شفیع)

ساتھ قتل سے خود ہی زخم کھائے ہوئے تھے، حجاج کی یہ باتیں اور بھی اُن کے زخموں پر نمک چھڑکتی تھیں۔ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نہ رہا گیا، کھڑے ہو گئے اور نہایت سخت وَ ﺷﺖ لہجے میں تین بار فرمایا: ''تو جھوٹا ہے، تو جھوٹا ہے، تو جھوٹا ہے۔''

اور فرمایا کہ اے بے وقوف! قرآن کی حفاظت پر تو وہ خداوندی قوت مسلط ہے کہ اگر تو اور تیرے سارے اعوان ہی نہیں بلکہ تمام جن وانس مل کر بھی اُس کی تحریف کرنا چاہیں تو قیامت تک نہیں کر سکتے۔ خداوند کریم کا وعدہ ہے:

وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ (سورۂ حجر:۹)

''بے شک! ہم قرآن کی حفاظت کرنے والے ہیں۔''

پھر عبداللہ ابن زبیر (رضی اللہ عنہما) جیسا عالم کیسے اس کا ارادہ کر سکتا ہے؟

اب تو حجاج کو جس قدر غیظ ہوگا اُس کو آپ بھی معلوم کر سکتے ہیں۔ غصے سے چہرہ سرخ ہو گیا۔ آنکھیں دہکنے لگیں اور کہا کہ ''دیکھو! اس بڈھے کا یہ جی چاہتا ہے کہ پکڑ کر اس کی گردن ماردی جائے، اور گھسیٹ کر برسرِ راہ ڈال دیا جائے، تا کہ اہل بقیع کے بچے اس کو کھینچتے پھریں۔''

حضرت عبداللہؓ کے قتل کی تدبیر:

مگر یہاں بھی آپ کے مقدس وجود پر دست درازی کرنے میں وہی خطرہ درپیش تھا جو خطبۂ جمعہ کے واقعے میں اس کے ہاتھ اور تلوار کو روکنے والا تھا۔ مجبوراً یہاں بھی خاموش رہنا پڑا، مگر اب یہ اس تدبیر میں لگا ہوا ہے کہ کسی طرح آپ کو حیلے سے قتل کرایا جائے۔ آخر ایک شخص کو حکم کیا کہ تم اپنے نیزے کی بھال (تیر کی نوک) زہر میں بجھا کر رکھ لو، اور جب عرفات میں لوگوں کا ازدحام ہو تو بے خبری میں یہ بھال عبداللہ ابن عمر

(رضی اللہ عنہما) کے کسی عضو میں چبھا کر جلدی سے علاحدہ ہو جاو۔ جب حج کے دن آے یہ شخص تاک میں تھا، جس وقت آپ جمرات پر رمی کرتے تھے۔ آپ کو غافل پا کر وہ زہر آلود بھال آپ کے پیر میں چبھائی اور چمپت (غایب) ہوا۔

اس وقت آپ کی حالت قابل دید ہے۔ عاشقانہ افعال حج کے پورا کرنے میں اس طرح مشغول ہیں کہ تن بدن کی بھی خبر نہیں۔ پیر رکاب کے ساتھ بندھ گیا ہے، خون سے اونٹنی کے مونڈھے سرخ ہو گئے ہیں، مگر آپ کو اس کی مطلقاً اطلاع نہیں۔ آپ کے فرزند حضرت سالم ابن عبداللہؓ کی نظر آپ کے پیر پر پڑ گئی۔ دیکھتے ہی سہم گئے اور عرض کیا کہ حضرت دیکھیے! آپ کے پیر میں کیا ہوا؟ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے یہ دیکھ کر اونٹنی بٹھلائی اور بندھے ہوے پیر کو رکاب سے نکالا۔ یہ سب کچھ ہو چکا مگر آپ کو اس وقت بھی اسی کا شغف ہے کہ کسی طرح مناسک (احکام حج) پورے ہوں۔ فوراً لوگوں کو حکم کیا کہ میرے مناسک پورے کراو۔ انہوں نے جس طرح ہو سکا آپ کے مناسک پورے کرائے اور آپ کو خیمے میں لا کر لٹا دیا۔

اب آپ کی تکلیف روبہ ترقی ہے۔ لحظہ بہ لحظہ حالت خراب ہوتی جاتی ہے۔ زخم کا زہریلا اثر آپ کے پیر سے سر تک رگ رگ میں پے وست ہو گیا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما بھی اپنی فراست سے سمجھ گئے ہیں کہ یہ حجاج کی سازش سے ہے۔

حجاج کی منافقانہ عیادت:

جب آپ کے مریض ہونے کی خبر لوگوں میں پھیل گئی تو ایک روز حجاج بھی منافقانہ عیادت کے لیے آپ کی خدمت میں آیا اور آپ کے زخم پر افسوس ظاہر کرتے ہوے کہنے لگا کہ اگر مجھ کو اس کام کے کرنے والے کا پتہ لگ جاے تو میں اُس کو اسی وقت قتل کر دوں۔ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کب اُدھار رکھنے والے تھے؟

فوراً فرمایا کہ: ''اُس کا کرنے والا وہ شخص ہے جس نے حرم شریف میں ہتھیار لے جانے کی خلاف شرع اجازت دی۔'' (مراد حجاج ہے، کیوں کہ حرم شریف میں ہتھیار لے جانے کی اسی نے اجازت دی تھی)۔ حجاج غصہ ہوکر رخصت ہوگیا۔

اِدھر آپ کا مرض ترقی کرتا رہا، آخر ایک روز اسی میں دارِ فانی کو خیر باد کہا۔ جان عزیز نذر کردی۔

لا یبالون فی اللّٰہ لومۃ لائم

''اللہ کے بارے میں کسی ملامت کرنے والے کی پرواہ نہیں کرتے۔''

کا وہ عہد جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تھا پورا کر کے چھوڑا: ۔

اگرچہ خرمن عمرم غمِ تو داد بیاد
بہ خاکِ پائے عزیزت کہ عہد نہ شکستم

اِنَّ فِی ذٰلِکَ لَعِبْرَۃً لِّاُولِی الْاَبْصَار (سورۂ آل عمران:۱۳)

''بے شک! اس میں آنکھ والوں کے لیے عبرت ہے۔''

حضرت سعید ابن جبیرؒ اور حجاج ظالم:

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کے واقعے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے کی دوسری کڑی حضرت سعید ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کے واقعے کو بتایا جائے، کیوں کہ ایک طرف اگر تابعی ہونے کی وجہ سے صحابہؓ کے بعد عموماً آپ ہی کا رُتبہ ہے تو دوسری جانب خصوصاً حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے آپ کو رشتۂ شاگردی بھی حاصل ہے[1]۔ اُن کے ساتھ بھی اُسی ظالم الامت حجاج نے ظلم کیا جس طرح حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیا تھا۔

---

(۱) حضرت سعید ابن جبیرؒ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے داماد ہیں۔ (شریفی)

یوں تو آپ کے زمانے میں صحابۂ کرامؓ کی مقدس جماعت کے بہت سے ارکان و اعیان موجود تھے، مگر تحصیل علم اور روایت حدیث بہ کثرت دو ہی حضرات سے کی ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عمر اور خیر الامت حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہم۔ اُن میں بھی آپ کے علوم کا بڑا حصہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے علوم کا پرتو تھا۔

آپ خود بیان فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی خدمت میں حاضر ہوتا اور علوم کے بیش بہا جواہرات سے مالا مال ہو کر اُٹھتا تھا۔ بعض مرتبہ تو یہ نوبت پہنچتی کہ میری بیاض اور صحائف آپ کی دریا کی طرح اُمنڈنے والی تقریر سے قاصر رہ جاتیں اور میں اپنے کپڑوں اور ہتھیلیوں کو لکھ لکھ کر چھاپ لیتا تھا۔

(طبقات ابن سعد: ج ۶، ص ۱۷۸)

حضرت عبداللہ ابن عمر اور حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہم سے رشتۂ شاگردی ہی، خواہ وہ کسی درجے میں ہو، شرف دینی و دنیوی اور کمال علمی و عملی کے لیے کچھ کم نہیں، لیکن جب ہم حضرت سعید ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کے حالات پر نظر ڈالتے ہیں تو آپ کی بلند پروازیاں اس سے بھی کہیں اونچی نظر آتی ہیں۔

ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں کہ نابینا ہونے کے بعد جب کوئی شخص حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کوئی مسئلہ دریافت کرتا تو آپ متعجبانہ یہ فرمادیا کرتے کہ کیا ابن ام وہما (سعید ابن جبیرؒ) کو چھوڑ کر مجھ سے مسئلہ دریافت کرتے ہو؟ طبقات دین سعد: (ج ۶، ص ۱۷۹)

ایک مرتبہ فرمایا کہ سعید! تم لوگوں کو حدیث پڑھایا کرو۔ حضرت سعیدؒ نے تواضع

سے عرض کیا کہ حضرت! ابن ام و ہما کی یہ مجال[1] کہ آپ کے کوفہ میں تشریف رکھتے ہوئے حدیث کی سند پر قدم رکھ سکے؟ آپ نے فرمایا کہ اے عزیز! یہ تو تمہاری خوش نصیبی ہے کہ تم ہمارے سامنے درس دو اور ہم تمہارے صواب کی تصویب اور خطاؤں کی اصلاح کیا کریں۔

اسی طرح حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ آپ سے کوئی فرایض (میراث) کا مسئلہ دریافت کیا گیا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ سعید ابن جبیرؒ کے پاس جاو، وہ حساب میں مجھ سے زیادہ واقف ہیں اور فرایض وہی بتلائیں گے جو میں بتلاتا۔ (طبقات ابن سعد)

یہ واقعات درحقیقت آپ کے دونوں اُستادوں کی جانب سے آپ کے لیے نیابت کا پیغام اور صحیح قایم مقام ہونے پر مہر ہیں۔

سبق آموز فایدے:

ہمیں ان واقعات سے چند مفید نتایج پر پہنچنا چاہیے:

۱...... استاذ کو چاہیے کہ اگر وہ اپنے شاگردوں میں کسی شخص کو ہونہار اور مستعد دیکھے تو لوگوں میں اُس کی توقیر کرے، تاکہ وہ بھی اس کی تعظیم کیا کریں (بہ شرطے کہ اُس کے

---

(۱) دارالعلوم دیوبند کے معین المدرسین (اور ان کے امثال) جن کو اپنے اساتذہ کے بھرے مجمع میں درس و تدریس کی نوبت آتی ہے اور اسی قسم کے خطرات اُن کے دامن گیر ہوتے اور کام میں الجھنیں پیدا کرتے ہیں، حضرت ابن عباسؓ کے اس اثر سے فایدہ اُٹھائیں۔ (شفیع)

حضرت مفتی صاحبؒ کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا تھا۔ خود فرماتے تھے کہ مجھے کئی مرتبہ زبانی اور خطوط کے ذریعے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہ نے حدیث پڑھانے کی طرف متوجہ فرمایا، میں ہر مرتبہ یہی کہتا تھا کہ جس جگہ حضرت الاستاذ مولانا سید انور شاہ صاحبؒ نے بیٹھ کر پڑھایا ہو وہاں میں بیٹھوں؟ لیکن حضرت مدنیؒ کے اصرار کے بعد سب سے پہلے "موطاء امام مالکؒ" پڑھائی۔ (شریقی)

اخلاق میں کوئی ناگوار اثر کے پیدا ہونے کا اندیشہ نہ ہو)۔

۲.....شاگرد کے لیے لازم ہے کہ وہ ہر حال میں استاذ کا ادب ملحوظ رکھے۔ اُستاذ اگر اس پر مہربان ہو اور اس کی وقعت کرے تو اس کو چاہیے کہ بہ قول شخصے: ''ایاز قدرِ خود بہ شناس''۔ اپنی حد سے نہ بڑھے۔

امام ابو یوسفؒ کا واقعہ اور اس کے نتائج:

مجھے یاد آیا کہ شیخ زین الدین ابن نجیم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ''بحر الرائق'' میں ایک واقعے کے ذیل میں نتائج بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں عرفہ کے روز امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر تھا کہ مغرب کا وقت ہوگیا۔ آپ نے مجھے امامت کے لیے ارشاد کیا(۱)۔ باوجودے کہ امام کا ادب میرا دامن کھینچ رہا تھا۔ امتثال امر ہی کو ترجیح دے کر آگے بڑھا اور نماز پڑھائی، لیکن طبیعت کی کش مکش سے نماز کے بعد تکبیر تشریق پڑھنی بھول گیا۔ امام صاحب نے پیچھے سے تکبیر پڑھی۔''

یہ نقل کر کے شیخ تحریر فرماتے ہیں کہ اس واقعے سے چند مفید نتائج مستنبط ہوتے ہیں:

۱...... ایک تو یہی مسئلہ کہ اگر تکبیر تشریق امام بھول جائے تو مقتدی ترک نہ کریں۔

---

(۱) کسی کو شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ عرفہ کے روز مغرب کے وقت امامت کا حکم کیسے دیا؟ جب کہ مغرب عشا کے وقت میں مزدلفہ میں پڑھی جاتی ہے۔ یہاں ''عرفہ کے روز'' سے ۹ ذوالحجہ مراد ہے، اور یہ ''یوم عرفہ'' ساری زمین پر اس دن ہوتا ہے جس دن کی تاریخ ۹ ذوالحجہ ہو۔ اگر حج کر رہے ہوتے تو اسے ''یوم الحج'' کہتے۔ (شریفی)

۲...... استاذ کے لیے مناسب ہے کہ جب کسی طالب علم کو نیک اور مستعد دیکھے تو لوگوں کے سامنے اُس کی تعظیم کرے، تا کہ وہ بھی اُس کی تعظیم و توقیر کیا کریں۔

۳...... شاگرد کے لیے لازم ہے کہ اُستاذ کے ادب کو کسی حال میں نہ بھولے، اگر چہ استاذ اس کی تعظیم کرے۔ دیکھو! امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اس عظمت پر کتنے مضطرب ہیں کہ تکبیر بھی بھول گئے۔

۴...... اُستاذ کی تعظیم اُس کی فرماں برداری اور اطاعت میں ہے نہ کہ اپنی مخترعہ اور خود ساختہ تہذیب میں۔" (بحرالرائق: ج۲،ص۱۶۶)

صاحب بحر کے استنباطات میں سے بالخصوص استنباط نمبر ۴ زیادہ قابل لحاظ ہے۔ کیوں کہ ابنائے زمانہ کی کوتاہیاں اس بارے میں حد سے گزر چکی ہیں، اور درحقیقت یہ ایک ضابطہ ہے جس سے بہت سے مواضع میں کام لیا جاسکتا ہے کہ ہر شخص کی تعظیم اُس کی اطاعت و فرماں برداری میں ہے نہ کہ من گھڑت تعظیمات میں۔

الغرض حضرت سعید ابن جبیرؒ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم کے تلمیذ رشید ہونے کے ساتھ آپ کے خلف الصدق اور صحیح قایم مقام بھی تھے۔ یوں تو اور بھی سیکڑوں علما و فضلا، زہاد و عباد آپ کے زمانے میں:

فَوْقَ كُلِّ ذِىْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ (سورۂ یوسف:۷۶)

"ہر ایک عالم سے بڑھ کر کوئی عالم ہوتا ہے۔"

کی شرح کر رہے ہیں، مگر آپ میں جامعیت علوم کا ایک ایسا وصف ہے جو آپ کو مرجع خلایق بنائے ہوے ہے۔

خصیف کا بیان ہے کہ علمائے تابعین میں طلاق کے مسایل کو سب سے زیادہ

جاننے والے حضرت سعید ابن المسیبؒ تھے[1]، اور مسایل حج میں سب سے زیادہ اعلم حضرت عطاء ابن ابی رباحؒ اور حلال وحرام میں حضرت طاؤسؒ یمانی اور علم تفسیر میں حضرت ابوالحاج مجاہد ابن جبیرؒ تھے، اور حضرت سعید ابن جبیرؒ ان سب میں جامع تھے۔
(ابن خلکان: ج ا، ص ۲۸۹)

آپ چوں کہ مرجع خواص وعوام تھے، اس لیے اگر خواص کے لیے شب و روز درس وتدریس کا فیض جاری تھا تو عوام کی تربیت کے لیے ہفتے میں دوبار وعظ بھی کہنا پڑتا تھا۔ آپ کو درس وتدریس کے شغل اور لوگوں کے ہجوم سے دوسرے کاموں کے لیے کیا کچھ فرصت ملتی ہوگی؟ اس کو وہی شخص کچھ جان سکتا ہے کہ جو یا تو اپنے زمانے کا مقتدا ہو اور یا کسی مقتدا کی خدمت میں رہ کر اُس کے حالات اوقات پر تفصیلی نظر ڈال چکا ہو، لیکن خداوند عالم اپنے مقبول بندوں کے اوقات میں کچھ ایسی برکت عطا فرمادیتا ہے کہ وہ اس تھوڑے سے وقت میں وہ کام کر جاتے ہیں جس کے لیے طویل طویل عمریں کفایت نہ کر سکیں[2]۔ آپ بہ ایں ہمہ مشغولی ہر دو رات میں قرآن مجید ختم کرتے تھے، اور ظاہر ہے کہ وہ ختم بھی ہمارے زمانے کا شبینہ نہ ہوگا جس کی پرواز ہمارے گلوں سے اونچی نہیں ہوتی۔

اس وقت آپ کی سوانح جمع کرنا تو مقصود نہیں، اس لیے باوجود تحریر کے طویل ہو جانے کے یہی کہنا پڑتا ہے کہ ؎

شرح ایں ارماں و ایں سوز جگر
ایں زماں بہ گذار تا وقتِ دگر

---

(۱) اسی مضمون کے ذیل میں ان شاء اللہ ناظرین آپ کا مفصل ذکر دیکھیں گے۔ (شفیع)

(۲) شیخ عبدالوہاب شعرانیؒ ''لطائف المنن والاخلاق'' میں اس مضمون پر گزرے ہیں اور خاصانِ خداوندی کے عجیب وغریب واقعات پیش کیے ہیں، اور میں تو یہ کہتا ہوں کہ شیخ شعرانیؒ کے کارنامے خود اس مضمون کی ایک روشن دلیل ہیں، جن کو خود شیخ شعرانیؒ نے اس کتاب میں جمع فرمادیا ہے۔ (شفیع)

اور اصل واقعے کی طرف متوجہ ہونا پڑتا ہے۔

جس ظالم کی تیغ جفا (ظلم وتشدد) ایک لاکھ بیس ہزار بے گناہ مسلمانوں کا بے وجہ خون پی چکی ہو[1] وہ اگر آج حضرت سعید ابن جبیرؒ کے درپے ہے تو کیا تعجب ہے؟ اور کیا ضرورت ہے کہ اُس کے لیے کوئی بڑا سبب باعث ہی پیش آیا ہو؟ مگر حسب الاتفاق یہاں ایک وجہ بھی پیش آ گئی ہے جو حضرت سعید ابن جبیرؒ کی شان کو اور بھی دوبالا کر دیتی ہے۔

حضرت سعیدؒ اور منصبِ قضا:

واقعہ یہ ہے کہ حضرت سعید رحمۃ اللہ علیہ شروع میں حجاج کی جانب سے ایک بڑے منصب پر ممتاز تھے۔ حجاج کو آپ کی ثقاہت و دیانت کی وجہ سے آپ پر یہاں تک اعتماد تھا کہ اکثر ہزاروں اور لاکھوں روپے اخراجات کے لیے آپ کو سپرد کر دیتا اور پھر کبھی حساب تک طلب نہ کرتا تھا۔ ایک مرتبہ آپ کو کوفہ کا قاضی بنا دیا، لیکن چوں کہ عجمی تھے اس لیے اہل کوفہ نے درخواست کی کہ ہمیشہ سے ہمارا قاضی عربی النسل ہوتا رہا ہے، آج بھی ہمیں اپنا قدیم دستور بدل دینا بہت شاق ہے، آپ ہمارے لیے کوئی عربی قاضی تجویز فرمائیں۔ حجاج چوں کہ آپ کی جلالتِ قدر سے پورا واقف ہے، اس لیے یہ تو ہرگز مناسب نہیں سمجھتا کہ اب آپ کو واپس بلائے، اور ادھر یہ بھی چاہتا ہے کہ اہل کوفہ کی درخواست بھی بالکل رد نہ ہو، اس لیے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے صاحب زادے حضرت ابو بردہؓ کو برائے نام کوفہ کا قاضی بنا کر بھیج دیتا ہے، اور اُن کو یہ تاکید کرتا ہے کہ تم کوئی کام بغیر اجازت حضرت سعید ابن جبیرؒ کے نہ کرنا۔ الغرض آپ کی جلالت کا سکہ فقط بھولے بھالے عوام مسلمین ہی کے دلوں پر بیٹھا ہوا نہ تھا بلکہ

---

(۱) کما رواہ الترمذی فی ابواب الفتن باب ماجاء فی ثقیف کذاب و مبیر۔

جبابرہ اور متکبرین کو بھی آپ کی جلالتِ شان کا اعتراف کرنا پڑتا تھا۔

حضرت سعید ابن جبیرؒ کچھ دنوں تک اسی طرح بسر کرتے رہے، مگر حجاج کے مظالم سے دل تنگ تھے۔ قوت نہ تھی کہ مقابلہ کر سکیں اور لوگوں کو اُس کے عذاب سے نجات دیں۔ جاہلانہ جوش بھی نہ تھا کہ بے دست و پائی میں خواہ مخواہ کی شورشیں اور فتنے کھڑے کر کے خود بھی پریشان ہوں اور لوگوں کو بھی مصایب میں ڈالیں، اور: ع

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

کے مصداق بنیں۔ صبر کے ساتھ موقع کے منتظر تھے [۱]۔

رتبیل کی جنگ میں شرکت اور حجاج سے بغاوت:

اسی اثنا میں حجاج نے بلاد (شہر) رتبیل پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا اور عبدالرحمٰن ابن محمد ابن اشعث رحمۃ اللہ علیہ کو جرنیلی کے لیے منتخب کر کے بیس ہزار نوجوانوں کا ایک جرار لشکر اُس کے ساتھ کر دیا، جن میں حضرت سعید ابن جبیرؒ امین اور خزانچی بنائے گئے۔ جنگ کے مصارف کے لیے جس قدر روپیہ کی ضرورت تھی وہ آپ کے سپرد کر دیا گیا۔ عبدالرحمٰن ابن اشعثؒ بھی حجاج کے مظالم اور جابرانہ احکام سے دل تنگ تھے، اور وہ کون نہیں تھا جو اُس کے پنجۂ ظلم سے نالاں نہ ہو۔ جب بلادِ رتبیل پر حملہ آور ہوئے اور وہاں بہ اذن اللہ کچھ فتوح حاصل ہو گئیں تو اب موقع کو غنیمت سمجھا اور اپنے ہم راہیوں اور وہاں کے باشندوں سے اپنے لیے بیعت لینے کا ارادہ کیا۔ لوگ خود ہی حجاج کے مظالم سے ڈرے ہوئے تھے، ہر ایک کے قلب میں خود اُس کا داعیہ موجود تھا، سب نے بہ رضا و رغبت عبدالرحمٰن ابن اشعثؒ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اس وقت ابن

---

(۱) سبحان اللہ! ان جملوں کو بار بار پڑھیے اور حالات حاضرہ کو بھی سامنے رکھیے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت نصیب فرمائے۔ آمین! بڑے پتے کی بات حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمائی ہے۔ (شریفی)

اشعثؒ کے ساتھ ایک خاصی قوت موجود ہے اور سب کی رائے ہے کہ اب خدا کی بستیوں کو حجاج کے ظلم سے پاک وصاف کر دیا جائے۔

اُدھر یہ خبر شدہ شدہ حجاج کو پہنچی تو جنگ کے لیے آمادہ ہو گیا اور ایک جرار لشکر ساتھ لے کر خود روانہ ہوا۔ اگرچہ امیرِ وقت عبدالملک اُس کی اس رائے کے مخالف ہے، مگر حجاج اپنے طیش وغضب میں اس کی پرواہ نہیں کرتا اور جنگ کے لیے نکل کھڑا ہوتا ہے۔

اِدھر سے عبدالرحمٰن ابن اشعثؒ بڑھتے ہوئے چلے آرہے ہیں اُدھر سے حجاج۔ آخر ایک وقت آیا کہ دونوں مقابل ہو گئے اور جنگ شروع ہو گئی۔ ہمارا مقصود چوں کہ اِس جنگ کی تاریخ پیش کرنا نہیں ہے بلکہ صرف نتیجہ دکھلانا منظور ہے، اس لیے اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ یہ جنگ کئی سال رہ کر حجاج ہی کے لیے مفید ثابت ہوئی اور عبدالرحمٰن شہید ہو گئے۔ وَاللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ۔

ما پروریم دشمن و ما می کشیم دوست
کس را چرا و چوں نرسد در قضائے ما

عبدالرحمٰنؒ کے ہم راہی کچھ تو اس جنگ میں کام آگئے، اور جو باقی رہے انہوں نے حجاج کے خوف سے اپنا اپنا راستہ لیا۔ کوئی کہیں جا کر روپوش ہو گیا اور کسی نے کہیں پناہ پکڑی، جن میں اکثر لوگوں نے حرم مکۂ معظمہ کو اپنی جائے پناہ بنائی۔ کیوں کہ اُس زمانے میں حضرت عمر ابن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ عبدالملک کی جانب سے والیٔ مکہ تھے، جن کا عدل وانصاف عدلِ فاروقی کی نظیر تھا، اور جو درحقیقت حجاج ظالم کا جواب ہو کر دنیا میں اس لیے آئے تھے کہ لوگوں کو لکل فرعون موسیٰ (ہر گم راہ کرنے والے پر ایک ہدایت کرنے والا مسلط ہوتا ہے) کے معنے آنکھوں سے مشاہدہ

کرادیں۔

لوگ جب حجاج کے ظلم وستم سے تنگ آتے تھے تو عراق کو چھوڑ کر مکۂ معظمہ کو جائے پناہ بناتے تھے۔ اس وقت بھی اِن آفت زدہ غریبوں نے اپنے لیے مکہ سے اچھی جائے پناہ نہ دیکھی۔ اکثر لوگوں نے حرمِ مکہ کو وطن بنالیا۔

ہمارے مقصود بالذکر حضرت سعید ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی جماعت کے ایک رکن ہیں۔ ایک عرصے تک حضرت عمر ابن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے سایۂ پناہ میں نہایت آرام کے ساتھ گزارتے رہے، لیکن ظاہر ہے کہ وہ حجاج جس کا ظلم کسی سبب کا بھی محتاج نہیں، بلکہ بہ قول شخصے: مقتضائے طبیعش انیست طبعی اور جبلی ہے۔ وہ عمر ابن عبدالعزیزؒ ہی سے کاہے کو خوش ہوتا؟ خصوصاً جب کہ وہ اُس کے مجرموں کو پناہ بھی دیتے ہوں۔ اس پر خود اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اُس کو حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ سے کیا کچھ بغض وحسد ہوگا؟

حجاج ہمیشہ آپ کے درپے رہتا اور امیر الوقت عبدالملک سے آپ کی شکایتیں لگاتا رہتا تھا۔ آپ نے بھی محض رفاہِ خلق کے لیے ایک مرتبہ حجاج کے مظالم کی شکایت عبدالملک کے گوش گزار کردی، لیکن حجاج عبدالملک کے یہاں اتنا منہ چڑھا ہوا تھا کہ اُس کے مقابلے میں کسی کی شنوائی نہ ہوتی تھی۔ آخر ایک روز حجاج اپنے مقصد میں کامیاب ہوا۔ عبدالملک نے حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ کو ولایت مکہ سے معزول کردیا اور آپ کی جگہ پر خالد قسری کو والی مکہ بنا کر بھیج دیا۔

خالد قسری اپنے سے پہلے والی کا حال دیکھ چکا ہے اور عبدالملک کے یہاں حجاج کے تقرب کا اندازہ کرچکا ہے۔ یہ اب دل میں یہ ٹھانے ہوئے ہے کہ ؏

زمانہ باتو نہ سازد تو با زمانہ بہ ساز

پر عمل کرے۔ اس نے اسی میں اپنی خیریت سمجھی کہ حجاج کے اشاروں پر چلے، اور اگر وہ دن کو رات کہنے لگے تو یہ "ایک ماہ و پروین" کہنے پر آمادہ ہو جائے۔

مکہ میں پہنچتے ہی اعلان کر دیا کہ کوئی شخص کسی عراقی کو اپنے گھر میں پناہ نہ دے، اور نہ اُس کو کوئی مکان کرایہ پر دے (تاریخ خلدون)، اور جو لوگ حجاج سے خائف ہو کر یہاں چلے آئے تھے اُن کو پکڑنا شروع کر دیا۔ انہیں اسیرانِ ظلم و ستم میں حضرت سعید ابن جبیرؒ بھی شامل ہیں۔ خداوند عالم کی شانِ بے نیازی کا ایک عجیب منظر ہے کہ فساق و فجار اس طمطراق میں ہیں اور مقبولِ بارگاہ بہ زبانِ حال اس ترنم میں:

بہ جرم عشق توام میکشند و غوغا ئیست
تو نیز برسرِ بام آکہ خوش تماشا ئیست

آخر چند روز کا سفر طے کر کے یہ اسیرانِ ستم کوفہ پہنچے۔ اِن کے ساتھ حجاج کا (اس کی طبیعت کے موافق) جو کچھ معاملہ ہونا چاہیے وہ محتاج بیان نہیں۔ نوبت بہ نوبت یہ لوگ اُس کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں اور وہ اُن کے بارے میں احکام جاری کرتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اب ہمارے مقصود بالذکر حضرت سعیدؒ کی باری آئی۔

حضرت سعیدؒ سے حجاج کا مکالمہ:

اب ہم اپنے محترم ناظرین کو اُس مکالمے کی سیر کراتے ہیں جو ایک خون خوار گورنر اور خرقہ پوش فقیر میں ہو رہا ہے، جس سے اکابر سلف کی قوتِ ایمانی کے ساتھ اس کا بھی اندازہ ہو سکے گا کہ اُن کو احکامِ خداوندی کے مقابلے میں جان و مال، عزت و جاہ کہاں تک عزیز تھے۔

حجاج: حضرت سعیدؒ کی طرف متوجہ ہو کر: تمہارا کیا نام ہے؟(۱)

حضرت سعیدؒ: سعید ابن جبیر۔

حجاج: بلکہ تو شقی ابن کسیر ہے(۲)۔

حضرت سعیدؒ: میری والدہ بہ نسبت تیرے میرے نام سے زیادہ واقف تھی۔

حجاج: تیری والدہ بھی شقی ہے اور تو بھی۔

حضرت سعیدؒ: غیب کی باتوں (شقاوت وسعادت) کا جاننے والا تو کوئی اور ہی ہے۔

حجاج: بہ خدا! میں تیری اس دنیوی عیش کو بھڑکتی ہوئی آگ سے بدل دوں گا۔

حضرت سعیدؒ: اگر میں جانتا کہ یہ نفع وضرر اور راحت وآرام تیرے ہاتھ میں ہے تو تجھے خدا سمجھتا اور سجدہ کیا کرتا۔

حجاج: اچھا! یہ کہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں تمہارا کیا عقیدہ ہے؟

حضرت سعیدؒ: آپ نبیٔ رحمت اور امامِ ہدایت ہیں۔

حجاج: اچھا یہ بتلاؤ کہ علی (کرم اللہ وجہہ) کے بارے میں تمہارا کیا اعتقاد ہے؟ کیا وہ جنت میں ہیں یا دوزخ میں؟(۳)

---

(۱) حجاج اگرچہ حضرت سعیدؒ اوران کے نام سے خوب واقف ہے، مگر اس وقت نام پوچھنا محض اظہار غضب پر مبنی ہے۔ (شفیع)

(۲) حضرت سعیدؒ کے نام میں دو لفظ تھے: سعید اور جبیر، جو دونوں بہ اعتبار اپنے معنی لغوی کے بڑائی پر دلالت کرتے ہیں۔ حجاج نے غصے کی وجہ سے ان دونوں کو اُن کی ضد سے بدل لیا، کیوں کہ سعید (نیک بخت) کی ضد شقی (بد بخت) ہے، اور جبیر (شدید التجبیر) کی ضد کسیر (بہت شکستہ) ہے۔ (شفیع)

(۳) اس قسم کے سوالات اس موقع پر بہ ظاہر بالکل بے محل ہوتے ہیں مگر میرا خیال ہے کہ اس سے حجاج کی یہ غرض ہے کہ حضرت سعیدؒ سے بادشاہی رعب اور اُمید وبیم کی کش مکش میں آ کر ان اعتقادیات میں کوئی لفظ غلط نکل جائے، وہ اس بہانے سے اُن کو قتل کر دے، تا کہ شورش عامہ سے محفوظ رہے۔ (شفیع)

حضرت علیؓ کے متعلق سوال اس لیے بھی کیا کہ حجاج بنو امیہ میں سے ہے، اور حضرت علیؓ کے متعلق اس کی رائے اچھی نہیں تھی اور اہل سنت کے خلاف بھی تھی۔ (شریفی)

حضرت سعیدؒ: اگر میں جنت و دوزخ کی سیر کرتا اور وہاں کے لوگوں کو دیکھتا تو مجھے معلوم ہوتا کہ کون جنت میں ہے اور کون دوزخ میں؟ (لیکن میں اس کا مدعی نہیں)۔

حجاج: اچھا! پھر خلفا کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟

حضرت سعیدؒ: میں اُن پر مؤکل و مسلط نہیں کہ اُن کے احوال کی تفتیش کروں۔

حجاج: تو یہ کہو کہ تمہارے نزدیک اُن میں سے کون اچھا ہے؟

حضرت سعیدؒ: جو خدا کے نزدیک زیادہ اچھا ہے وہی میرے نزدیک سب سے اعلیٰ اور اشرف ہے۔

حجاج: اچھا! تو خدا کے نزدیک کون زیادہ پسندیدہ ہے؟

حضرت سعیدؒ: اس کا علم اُس کو ہے جو اُن کے ظاہر و باطن کو یک ساں جانتا ہے۔

حجاج: (حضرت سعیدؒ کی صفائی اور حق گوئی سے متاثر ہو کر، نرم لہجے میں) میں یہ چاہتا ہوں کہ تم کسی بات میں تو میری تصدیق کرو۔

حضرت سعیدؒ: اگر مجھے تمہاری محبت نہ ہوتی تو تمہاری تکذیب نہ کرتا۔

حضرت سعیدؒ کے اس ارشاد کا یہ مطلب ہے کہ میرا یہ رد اور تکذیب کرنا درحقیقت تمہاری محبت پر مبنی ہے، کیوں کہ میرا مقصود اِس ساری دردسری سے تم کو قہرِ الٰہی اور عذابِ اُخروی کی دردناک جگہوں سے بچانا ہے۔

چناں چہ حدیث میں ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ مسلمان بھائی کی مدد اُس وقت بھی کرنی چاہیے جب کہ وہ مظلوم و ستم رسیدہ ہو۔ اور اُس وقت بھی جب کہ وہ ظالم ہو۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مظلوم کی امداد تو یہ ہے کہ ہم اُس کو ظلم سے چھڑا دیں، یہ فرمایئے کہ ظالم کی امداد کیسے کریں؟ آپ نے

فرمایا کہ ظالم کی امداد یہی ہے کہ تم اُس کو ظلم سے روکو۔ اسی لیے مبتلائے معاصی کی حقیقی محبت یہی ہے کہ اُس کو معاصی سے روکا جائے۔ ولنعم ما قیل:۔

محبتی فیك تأبی عن مسامحتی

بان اراك علی شیٔ من الزلل

”مجھ کو تمہاری محبت اس بات پر چشم پوشی کرنے سے منع کرتی ہے کہ میں تم کو کسی خطا و گناہ میں دیکھوں۔“

حجاج: تمہیں کیا ہوا ہے کہ تم کسی بات پر ہنستے نہیں؟

حضرت سعیدؒ: وہ شخص کیسے ہنس سکتا ہے جو مٹی سے پیدا کیا گیا ہو، اور اُسے یہ بھی معلوم ہو کہ آگ مٹی کو کھا سکتی ہے[1]۔

حجاج: اچھا! پھر ہم کیوں کر ہنستے ہیں؟

حضرت سعیدؒ: قلوب برابر نہیں ہوتے (کوئی غافل ہوتا ہے کوئی بے دار)۔

حجاج اگر چہ اُن لوگوں میں سے نہیں جن کو کسی کی حق گوئی یا راستبازی اپنے ارادے سے روک دے، مگر معلوم نہیں کہ آج اُس پر کون سا افسوں (منتر) پڑھ دیا گیا ہے کہ حضرت سعیدؒ ہر بات میں اُس کی مخالفت کر رہے ہیں اور وہ ڈھیلا ہوتا جاتا ہے۔ جب اس باہمی گفتگو پر بجائے اس کے وہ آپ کے قتل کا حکم کرتا اب خدام کو یہ حکم کر رہا ہے کہ قیمتی موتی اور یاقوت وزبرجد حضرت سعیدؒ کے سامنے حاضر کر دیں۔

حضرت سعیدؒ: یہ مال اگر تو نے اس لیے جمع کیا ہے کہ اہوال قیامت اور عذاب

---

(۱) کسی صاحب دل نے انہیں معنی کو اس شعر میں نظم کیا ہے:۔

وکیف تنام العین وھی قریرۃ ولم تدر فی ای المحلین تنزل

”وہ آنکھ ٹھنڈی ہو کر کیوں کر سو سکتی ہے جب کہ یہ معلوم نہیں کہ جنت اور دوزخ میں سے اُس کا ٹھکانہ کس جگہ ہے؟“ (شفیع)

اُخروی سے تیرے لیے ڈھال بن جائے؟ تو بہتر ہے۔ ورنہ یاد رکھو کہ قیامت کا ایک زلزلہ والدہ کو اپنے شیر خوار بچے سے بے پرواہ کردے گا، اور حلال طیب کے سوا دنیا کے کسی مال میں خیر نہیں۔

حجاج: یہ سب کچھ سُن سنا کر بے پروائی کے ساتھ راگ باجے میں مشغول ہو گیا۔

حضرت سعیدؒ: باجے کی آواز سنتے ہی زار زار رونے لگے۔

حجاج: اے سعید! یہ کیا حرکت ہے؟ یہ تو ایک قسم کی تفریح ہے، پھر اس سے رونے کو کیا نسبت؟

حضرت سعیدؒ: مجھے اس باجے میں پھونک مارنے سے قیامت کا وہ خوف ناک دن یاد دلا دیا ہے جس میں صور پھونکا جائے گا، اور یہ بھی معلوم ہے کہ یہ باجا ایک لکڑی ہے، جو بغیر حق کے کسی کے درخت سے کاٹی گئی ہے، اور اُس کی تانت بھی کسی مغصوبہ بکری سے لی گئی ہے، جس کے ساتھ تیرا حشر ہونے والا ہے۔

حجاج اے سعید! تم پر ہلاکت!! یہ کیا بے باکی ہے؟

حضرت سعیدؒ: جس کو اللہ نے دوزخ سے دور رکھ کر جنت میں داخل کر دیا ہو اس کی ہلاکت کیا؟

حجاج: اب تو غصے میں آگ ہو گیا اور کہا کہ اے سعید! معلوم ہوتا ہے کہ اب تم زندگی سے بے زار ہو چکے ہو، تو اب تم ہی پسند کر لو کہ میں تمہیں کس طرح قتل کروں؟

حضرت سعیدؒ: اے حجاج! تو اپنے لیے جس قسم کا قتل پسند کرتا ہو میرے لیے وہی قتل اختیار کر لے، کیوں کہ تو جس طرح آج مجھے قتل کرے گا قیامت میں خدائے عزوجل تجھ کو اُسی طرح قتل کرے گا۔

حجاج: اچھا! تم چاہتے ہو کہ ہم تمہاری جان بخشی کر دیں؟

حضرت سعیدؒ: یہ تیرے اختیار میں نہیں۔ اگر جان بخشی ہوگی تو خدائے بے نیاز کی جانب سے ہے، مگر تیرے لیے کسی طرح برأت نہیں اور نہ کوئی عذر مسموع۔

حجاج اپنے سپاہیوں سے مخاطب ہوکر: اس کو لے جاکر قتل کردو۔

حضرت سعیدؒ: نہایت مسرت کے ساتھ ہنستے ہوئے باہر آ گئے۔

سپاہی: حضور! یہ گستاخ مجرم آپ کے حکم پر ہنستا ہے۔

حجاج حضرت سعیدؒ کو واپس بلا کر: تم کس بات پر ہنستے ہو؟

حضرت سعیدؒ: مجھے اس پر ہنسی آئی کہ تو اللہ تعالیٰ پر کتنی جرأت کرتا ہے اور وہ تجھ پر کتنی بردباری؟

حجاج: اچھا! اس کو ہمارے سامنے قتل کرو۔

حضرت سعیدؒ: نہایت اطمینان سے (گویا سونے کے لیے بستر پر لیٹے ہیں) رو بہ قبلہ لیٹ کر:

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝ (سورۂ انعام: ۸۰)

''میں سارے مذاہب باطلہ سے الگ ہوکر اپنا رُخ اُس ذات کی طرف پھیرتا ہوں جس نے آسمان و زمین پیدا کیے، اور میں مشرکین میں سے نہیں۔''

حجاج حضرت سعیدؒ کو توجہ قبلہ پر مسرور و شادماں دیکھ کر: اِس کا منہ قبلے سے پھیر دو۔

حضرت سعیدؒ اِن باتوں سے کب متاثر ہونے والے تھے؟ جس کروٹ لٹایا لیٹ گئے اور یہ ورد زبان پر رہے:

اَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (سورۂ بقرہ: ١١٥)

"تم جس طرف پھرو اللہ اُسی طرف ہے۔"

حجاج حضرت سعیدؒ کو اس پر بھی مسرور دیکھ کر: اس کو اوندھا کر دیا جائے۔

حضرت سعیدؒ، جن کا رُخ صرف ایک خدائے بے نیاز کی طرف ہے، جو حدود مکان اور جہان (دنیا) سے اعلیٰ اور برتر ہیں، اس پر بھی اُسی خوشی کے ساتھ راضی ہیں اور یہ آیت وردِ زبان ہے:

مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرٰى. (سورۂ طٰہٰ: ٥٥)

"ہم نے تمہیں زمین سے ہی پیدا کیا ہے اور اُسی سے نکالیں گے اور اُسی میں دوبارہ زندہ کریں گے۔"

حجاج اِس آزاد بندۂ خدا کو بہ قول شخصے: کہ وہ جس حال میں رکھے وہی حال اچھا ہے، ہر طرح راضی دیکھ کر: اچھا اس کو ذبح کر ڈالو۔

حضرت سعیدؒ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ پڑھ کر: اے حجاج! لے!! میرا یہ آخری کلمہ محفوظ رکھ، یہاں تک کہ ہم قیامت میں خدا کے سامنے حاضر ہوں۔ اس کے بعد فدائے قوم اپنے آخری لمحۂ حیات میں یہ دعا کرتا ہے:

اللهم لا تسلطه على احد يقتله بعدى

"اے میرے اللہ! میرے بعد تو اس ظالم کو کسی کے قتل پر مسلط نہ کیجیے۔"

حجاج: اس گستاخ کو زیادہ بولنے کی فرصت نہ دو۔

یہ سن کر حجاج کو دروازۂ جہنم تک پہنچا دینے والے ذمے دار نوکر دوڑے اور اُس سر

کوتن سے الگ کردیا، جس کا زمانہ محتاج تھا۔

حضرت سعیدؒ سے خون کے فوارے جاری ہیں اور وہ اُس میں اس طرح لتھڑے ہوئے ہیں کہ گویا نہایت اطمینان کے ساتھ غسل کیا ہے۔

حضرت سعیدؒ کی شہادت اور اطبا کی تشخیص:

حجاج کو اس وقت یہ حیرت درپیش ہے کہ اُس کا دستِ بے داد کسی غریب کے خون پر صرف آج ہی نہیں اُٹھتا بلکہ یہ تو اُس کے ہاتھ کی طبعی حرکت ہے، جو لاکھوں مرتبہ صادر ہو چکی ہے، مگر آج سے پہلے کسی شہید جفا (مظلوم شہید) کے مذبوح گلے کو اتنا خون دیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اس تعجب کو پورا کرنے کے لیے اطبا کو جمع کر کے یہ سوال پیش کیا اور دریافت کیا کہ سعید ابن جبیرؒ کے بدن سے اتنا خون جاری ہونے کی کیا وجہ ہے؟

اطبا نے عرض کیا کہ حضور! خون روح کے تابع ہوتا ہے۔ اب تک جن کو آپ نے قتل کیا ہے اُن کی روح خوف کی وجہ سے قتل سے پہلے ہی پرواز کر جاتی تھی۔ اُن کے بدن سے خون کم نکلتا تھا، اور سعید ابن جبیرؒ کے خیال میں موت کوئی خوف کی چیز ہی نہیں تھی۔ وہ اُس وقت مقتول ہوئے جب کہ اُن کی رگ رگ خون سے جوش مار رہی تھی۔

بہر حال! آج ۹۵ھ کا ماہ شعبان (مئی ۷۱۵ء) ہے، جس میں دنیا حضرت سعیدؒ کے وجود سے مایوس ہو چکی ہے۔ آپ شہر واسط کے فنا میں دفن کر دیئے گئے اور آج تک آپ کا مزار مرجع خواص و عوام ہے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کو جب حضرت سعید ابن جبیرؒ کی شہادت کی خبر

پہنچی تو فرمانے لگے: ’’واللہ! اگر تمام روئے زمین کے آدمی سعید ابن جبیر کے قتل میں شریک ہوتے تو بے شک اللہ تعالیٰ سب کو سر کے بل جہنم میں جھونک دیتا۔‘‘

حجاج پر مصیبت کے پہاڑ اور حضرت سعیدؒ کی دعا کی قبولیت:

حجاج نے بھی جو کیا کر گزرا، مگر اب اُس کے زہریلے ثمرات کا مزہ دنیا ہی میں چکھ رہا ہے۔ اس کے بعد ہی فوراً بیمار پڑ گیا اور مرض روز بہ روز روبہ ترقی ہے۔ رات کو ایک تو خود ہی شدتِ مرض کی بے چینی سونے کی اجازت نہیں دیتی، اور اگر کبھی آنکھ لگ بھی جاتی ہے تو دوسری مصیبت سر پر سوار ہوتی ہے کہ خواب میں دیکھتا ہے کہ حضرت سعیدؒ اُس کا دامن پکڑے ہوئے کھینچ رہے ہیں اور کہتے ہیں: ’’او خدا کے دشمن! تو نے مجھے کس گناہ پر قتل کیا؟‘‘ یہ دیکھتے ہی چونک کر اُٹھا جاتا ہے۔ غرض چین کی نیند کا تو یہیں خاتمہ ہو چکا۔(۱)

بیماری میں اگر کبھی غشی بھی طاری ہو جاتی ہے تو وہی مہیب منظر سامنے آتا ہے جس کا ظہور حاضرین پر اس سے ہوتا ہے کہ جب وہ ہوش میں آتا تو یہ کلمات زبان پر ہوتے ہیں:

مالي ولسعيد ابن جبير؟

’’سعید ابن جبیر میرے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہیں؟‘‘

آخر حضرت سعیدؒ سے ایک ماہ بعد اسی اضطراب و بے چینی نے اس کی جان لے

---

(۱) حضرت مفتی صاحبؒ کی زیرِ نظر تحریر دل پذیر یہاں تک لکھی گئی تھی اور رجب المرجب ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء کے ماہ نامہ ’’القاسم‘‘ دیوبند میں چھپ گئی تھی۔ اس کے بعد پندرہ ماہ خاموشی سے گزر گئے جمادی الثانی ۱۳۳۹ھ/فروری ۱۹۲۱ء میں جب تیرھویں قسط چھپی تو حضرت مفتی صاحبؒ نے شروع میں یہ تحریر فرمایا: ’’مدت کے بعد آج پھر بھولا ہوا مشغلہ یاد آیا۔ ناظرین کرام سلسلے کے لیے القاسم رجب ۱۳۳۸ھ کی چند سطریں ملاحظہ فرمالیں، اور چوں کہ مضمون کی طوالت سے ناظرین کے دل برداشتہ ہو جانے کا خطرہ ہے، اس لیے اس سلسلے کو ان شاء اللہ اسی نمبر (تیرھویں قسط) پر ختم بھی کر دیا جائے گا۔‘‘ (شریفی)

کر چھوڑی۔ شعبان میں حضرت سعیدؒ کی شہادت ہوئی اور رمضان[1] میں حجاج کو دنیا سے منہ چھپانا پڑا، اور حضرت سعیدؒ کی دعا مقبول ہوئی کہ خداوند عالم نے ان کے بعد اس کو کسی کے قتل کی مہلت نہیں دی۔

دنیا تو حجاج کے وجود سے پاک ہوگئی اور لوگ گوشۂ قبر میں رکھ کر فارغ ہوے۔ اب وہ ہے اور خدائے قدیر۔ معلوم نہیں اس کے ساتھ کیا معاملہ ہوا؟

ہاں یہ ضرور بیان کیا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد بعض لوگوں نے حجاج کو خواب میں دیکھا اور دریافت کیا کہ خداوند عالم نے تیرے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ کہا کہ جتنے آدمیوں کو میں نے بے گناہ قتل کیا تھا خدا تعالیٰ نے مجھے ہر ایک کے بدلے میں ایک ایک مرتبہ قتل کیا، اور سعید ابن جبیر کے بدلے میں ستر مرتبہ قتل کیا ہے۔ واللہ بصیر بحال عبادہ! (ابن خلکان: ج۱،ص۱۲۰)

حضرت حطیط زیاتؒ اور حجاج ابن یوسف:

حجاج کی خون آشام تلوار اگر تیز تھی اور اس کے جگر دوز تیر اگر ٹھیک نشانے پر پہنچنے والے تھے تو خدائے قدوس کے وہ بندے بھی وہیں موجود تھے جو حق کی آواز بلند کرنے کے لیے اپنے سروں اور سینوں سے ان کا مقابلہ کرتے تھے۔ جس پر مذکورۃ الصدر واقعات کی شہادت پیش کی جا چکی ہے۔ اسی سلسلے میں چند واقعات اور ہدیۂ ناظرین کیے جاتے ہیں۔

جیسا کہ حجاج کی عادت تھی کہ علما وصلحا کو اکثر ستاتا اور ایذائیں پہنچاتا تھا۔ ایک

---

(۱) یہ اکثر مورخین کا قول ہے، اور تاریخ کی ایک روایت یہ بھی ہے کہ حجاج کا انتقال آپ سے چھ مہینے بعد ہوا، مگر اس عرصے میں وہ کسی کو قتل نہیں کرسکا۔ (شفیع)

روز حضرت حطیط زیات رحمۃ اللہ علیہ کو بھی پکڑ بلایا، اور کہا کیا تو ہی حطیط زیات ہے؟

آپ نے فرمایا: ہاں! میں حطیط ہوں، جو تیرا جی چاہے دریافت کر۔ اس لیے کہ میں نے مقامِ ابراہیم کے پاس اللہ تعالیٰ سے تین باتوں کا عہد کیا ہے:

ایک تو یہ کہ اگر مجھ سے کبھی کوئی بات دریافت کی جائے تو میں سچ بولوں گا اور حق کے خلاف کوئی کلمہ منہ سے نہ نکالوں گا۔

دوسرے یہ کہ اگر مجھے کسی تکلیف میں مبتلا کیا جائے گا تو میں صبر کروں گا۔

تیسرے یہ کہ اگر مجھے عافیت دی جائے گی تو میں شکر کروں گا۔

حجاج نے کہا کہ اچھا! بتلا کہ میرے بارے میں تیرا کیا خیال ہے؟

اب جو ایک خون خوار گورنر کے اوصاف حضرت حطیطؒ نے اس کے منہ پر بیان کیے، سننے کے قابل ہیں۔

آپ نے فرمایا کہ تو زمین پر اللہ کے دشمنوں میں سے ہے، تو حُرماتِ شرعیہ کا ہتک کرتا ہے اور محض تہمت پر بے گناہوں کو قتل کر دیتا ہے۔

حجاج نے کہا: اچھا! تو امیر المومنین عبدالملک ابن مروان کے بارے میں تم کیا خیال رکھتے ہو؟

آپ نے فرمایا کہ وہ تجھ سے زیادہ مجرم ہے، بلکہ تو بھی اسی کے گناہوں میں سے ایک مجسم گناہ ہے۔

حجاج کے غصے کا جو حال ہوگا وہ اس کے کوائف پڑھنے والوں سے مخفی نہیں۔ یہ سن کر جھنجلا اُٹھا اور کہا کہ اس کے لیے سخت سے سخت عذاب کی تدبیر سوچو۔ چناں چہ ایک بانس بیچ سے چیرا گیا اور حضرت حطیطؒ کے مبارک بدن پر رکھ کر ان کا گوشت اس کی شق میں داخل کیا گیا اور اوپر سے مضبوط باندھ دیا گیا، اور حجاج نے حکم دیا کہ اس

بانس کو پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے سڑک میں پھراو، یہاں تک کہ یہ گوشت بدن سے الگ ہو جائے، اور جب ایسا ہو تو کسی دوسری جگہ کا گوشت اس بانس کی شق میں باندھ کر اسی طرح کھینچو، اور جب تک تمام بدن کا گوشت الگ نہ ہو جائے ایسے ہی کرتے رہو۔

ظلم اور بے رحمی کے پتلوں (حجاج کے سپاہیوں) نے ایسا ہی کیا۔

دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اس عذاب شدید کو دیکھنے اور سننے والوں کے جگر شق ہو رہے تھے، مگر اس مجسم صبر و تحمل کی زبان سے اُف تک نہ سنی۔ آخر اسی عذاب میں آپ کی شہادت کا وقت بھی آپہنچا اور نزع شروع ہو گیا۔ اس وقت حجاج کو خبر کی گئی تو کہا کہ اچھا! اس کو نکال کر بازار میں پھینک دو۔ (احیاء العلوم کشوری: ج ا ص ۱۶۸)

حضرت حطیطؒ کا آخری وقت:

حضرت جعفرؒ کہتے ہیں کہ جس وقت حضرت حطیطؒ بازار میں پڑے ہوئے دم توڑ رہے تھے تو میں اور ان کے ایک دوسرے دوست خبر سن کر وہاں پہنچے۔ ہم نے پوچھا کہ تمہیں کوئی حاجت ہو تو کہہ دو؟ انہوں نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہا کہ "ایک گھونٹ پانی"۔ ہم نے پانی لا کر دیا۔ پانی کا پینا تھا اور روح کا پرواز کرنا۔

اور اب سب امور پر طرفہ یہ ہے کہ جس وقت نہایت استقامت کے ساتھ ان تکالیف کا تحمل کیا جا رہا ہے وہ آپ کی عمر کا اٹھارھواں سال ہے۔ اس سن و سال کو دیکھو اور اس الوالعزمی اور عالی ہمتی کو خیال کرو۔ آخر اس عنفوان شباب (خالص جوانی) میں دنیا کو خیر باد کہا۔

خدا کے عاشق جاں باز کی لاش بازار میں پڑی ہوئی ہے، اور اُس کی حق گو زبان اگر چہ بہ ظاہر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکی ہے، مگر در حقیقت وہ اپنی خاموشی سے یہ کہہ

رہی ہے:۔

اگرچہ خرمن عمر غم تو داد بہ یاد
بہ خاک پائے عزیزت کہ عہد نہ شکستم

حضرت حسنؒ اور حجاج ابن یوسف:

حجاج کا ظلم وستم اور اس کی ناجائز حرکتیں تمام علما وصلحا کو اس سے بے زار کر چکی ہیں۔ کسی تذکرے میں ایک روز حضرت حسنؒ نے حجاج اور اس کے اعوان کے لیے بددعا کرتے ہوئے فرمایا: "انہوں نے اللہ کے بندوں کو درہم ودینار پر بے گناہ قتل کیا ہے، خدا تعالیٰ انہیں برباد کرے"۔

حجاج کو بھی اس کی خبر پہنچ گئی، فوراً طلب کیا۔ حضرت حسنؒ بے خوف وخطر تشریف لائے۔ حجاج نے کہا: کیا تم ہی کہتے ہو اللہ ان کو برباد کرے؟ وہ خدا کے بندوں کو درہم ودینار پر قتل کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں! میں کہتا ہوں۔

حجاج نے کہا: یہ کیوں؟

آپ نے فرمایا کہ اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے علما پر فرض کیا ہے کہ وہ حق کو صاف صاف بیان کر دیں، اور کسی مخلوق کے خوف یا دنیا کی طمع کی وجہ سے اُس پر پردہ نہ ڈالیں۔

حجاج یہ سن کر بولا کہ اے حسن! اپنی زبان روکو۔ اس کے بعد مجھے کوئی ایسا کلمہ تمہاری جانب سے نہ پہنچے، ورنہ یاد رکھو کہ اس تلوار سے تمہارے سر اور بدن کے سارے رشتے قطع کر دوں گا۔

مگر حضرت حسنؓ کب چاہتے ہیں کہ خدا اور رسول کے رشتے قطع ہوں اور یہ رشتے باقی رہیں؟ ان حضرات کا تو یہ خیال تھا:

ولست ابالی حسین اقتل مسلما

علی ای جنب کان فی اللہ مصرعی

''جب کہ میں مسلمان قتل کیا جاؤں تو مجھے پرواہ نہیں کہ میں کس کروٹ گرا۔''

یہ چند واقعات ہیں جو علماے سلف کو امر بالمعروف کے متعلق حجاج کے ساتھ پیش آے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر اس سلسلے میں وہی واقعات تحریر میں لاے جائیں جن کا تعلق ایک حجاج کی ذات سے ہے تو اس کے لیے بھی ایک دفتر کی ضرورت ہے۔ اس لیے ہم اس سلسلے کو یہیں ختم کر کے چند واقعات وہ بھی پیش کرتے ہیں جو دوسرے ظالم(۱) بادشاہوں کے ساتھ علماے سلف کو پیش آے ہیں۔ کیوں کہ ہر قرن اور ہر زمانے اور ہر طبقے میں خدا کے سر فروش بندے ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کے لیے کمر بستہ رہے ہیں۔

---

(۱) یاد رہے کہ جن بادشاہوں کو ہم ان واقعات کے ضمن میں ظالم کہتے ہیں وہ بہ استثنا حجاج ایسے بادشاہ تھے کہ اگر آج ان میں سے کوئی ظاہر ہو تو تمام دنیا کے منصفین کا عدل و انصاف اُن کے ظلم پر قربان ہو جانے کے لیے آمادہ ہو جاے۔ (شفیع)

آٹھواں باب

خدا کے سرفروش بندے

حضرت ابن ابی ذئبؒ اور ابوجعفر منصور:

آپ کا نام محمد ہے، اور اپنے زمانے کے اکابر محدثین میں سے ہیں۔ امام ذہبیؒ نے ''تذکرہ'' میں حضرت امام احمد ابن حنبلؒ سے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ حضرت ابن ابی ذئبؒ حضرت امام مالکؒ سے افضل ہیں۔ صایم الدہر رہتے تھے اور تمام رات تہجد وتلاوت میں گزرتی تھی۔ کثرت عبادت کا یہ حال تھا کہ اگر اُن سے کہا جاتا کہ کل قیامت قایم ہوگی تو وہ اپنی قدیم اور دایمی عبادت سے کچھ زاید نہ کرسکتے۔ حق گوئی اور امر بالمعروف میں بھی شہرۂ آفاق تھے۔

(سراج الملوک: ص ۳۴، تذکرۃ الحفاظ: ج ۱، ص ۲۷)

حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ میرے چچا نے مجھے بیان کیا کہ میں امیر المومنین ابوجعفر منصور کے دربار میں بیٹھا تھا، اور اس مجلس میں حضرت ابن ابی ذئبؒ بھی موجود تھے۔ اتفاق سے اس وقت غفاریین مدینہ سے حاضر دربار ہوے اور بعض امور میں حسن ابن زید کی شکایت کرنے لگے، جو کہ منصور کی طرف سے مدینۂ منورہ کے گورنر تھے اور خود اس مجلس میں موجود تھے۔ حسن ابن زید اپنی شکایت سن کر بولے

کہ اے امیر المومنین! ان شکایت کرنے والوں کا حال ابن ابی ذئب سے دریافت کیجیے کہ اُن کے کہنے پر کہاں تک وثوق کیا جاسکتا ہے اور یہ لوگ کس درجے کے ہیں؟ منصور نے ابن ابی ذئبؒ سے خطاب کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ بے شک! میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ لوگ بہت لوگوں کی آبروریزی کرنے والے ہیں اور ان کو ناحق ایذا دینے والے ہیں۔

منصور نے غفاریین کی طرف متوجہ ہوکر کہا کہ تم نے سن لیا جو تمہارا حال ہے؟ غفاریین نے عرض کیا کہ اچھا اے امیر المومنین! اسی ابن ابی ذئبؒ سے ابن زید کی بھی تعریف کرائیے۔

منصور نے پوچھا کہ اے ابن ابی ذئب! حسن کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟ آپ نے اس گورنر کا حال بھی اسی طرح بے تکلف اس کے منہ پر کہہ دیا جیسے قبیلۂ غفاریین کا اور کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ خلاف حق فیصلے کرتا ہے اور اپنی خواہشات کا اتباع کرتا ہے۔

منصور حسن کی طرف متوجہ ہوا اور کہا کہ اے حسن! آپ نے سن لیا کہ ابن ابی ذئب تمہارے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ اور میں جانتا ہوں کہ وہ ایک مقدس بزرگ ہیں، ان پر جھوٹ کا گمان بھی نہیں ہوسکتا۔ حسن نے کہا: اچھا امیر المومنین! انہیں بزرگ سے ذرا آپ اپنا حال تو دریافت فرمائیے؟

منصور نے کہا: اے ابن ابی ذئب! میرے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اے امیر المومنین! اس سے مجھے معاف رکھو۔ منصور نے کہا کہ میں تمہیں اللہ کی قسم دیتا ہوں ضرور بیان کرو۔ آپ نے فرمایا کہ آپ تو اپنا حال مجھ سے اس طرح دریافت کررہے ہیں کہ گویا آپ کو خبر ہی نہیں۔ منصور نے کہا: تمہیں خدا کی

قسم! ضرور کہو۔ اب تو حضرت ابن ابی ذئبؒ نے امیر المومنین کا کچا چٹھا بھی ان کے سامنے رکھ دیا اور کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ تو نے اس مال کو ناجائز طریقے سے ظلماً وصول کیا اور بے مصرف صرف کیا، اور میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے دروازے پر کھلم کھلا ظلم کیا جاتا ہے۔

اب تو امیر المومنین کی آنکھیں کھلیں۔ غصے سے سرخ ہو گئے اور اسی غصے کے جنون میں اٹھ کر حضرت ابن ابی ذئبؒ کی گردن دبالی اور کہا کہ خبردار! خدا کی قسم اگر میں اس جگہ بیٹھا ہوا نہ ہوتا تو تمہیں اس سرکشی کا تماشا دکھلا دیتا۔ حضرت ابن ابی ذئبؒ نے فرمایا: امیر المومنین! حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہما خلیفہ بنائے گئے تو انہوں نے اپنا حق وصول کیا اور انصاف کے ساتھ تقسیم کر دیا، اور انہوں نے فارس اور روم کی گردن دبائی اور ان سے ناک رگڑ وائی۔ منصور نے حضرت ابن ابی ذئبؒ کی گردن چھوڑ دی اور کہا کہ واللہ! اگر میں یہ نہ سمجھتا کہ تم سچے ہو تو اسی وقت قتل کر دیتا۔

حضرت ابن ابی ذئبؒ نے کہا: اے امیر المومنین! خدا کی قسم میں آپ کے بیٹے مہدی سے زیادہ آپ کا خیر خواہ ہوں۔

حضرت امام شافعیؒ کا بیان ہے کہ میرے چچا فرماتے تھے کہ ہم نے سنا ہے کہ جب حضرت ابن ابی ذئبؒ یہاں سے واپس ہوئے تو راستے میں حضرت سفیان ثوری سے ملاقات ہوگئی، تو حضرت سفیانؒ نے فرمایا کہ جو کلام آپ نے اس ظالم سے کیا ہے میں اُس کو سن کر بہت خوش ہوا، مگر مجھے یہ ناگوار ہوا کہ تم نے اس کے بیٹے کو مہدی کیوں کہا؟ حضرت ابن ابی ذئبؒ نے فرمایا کہ اے سفیان! ہم تو سب کے سب مُہدِی ہیں، کیوں کہ ہر شخص بچپن میں مہد (گہوارے) کے اندر بیٹھتا ہے۔ مطلب یہ کہ میری مراد مہدی سے ہدایت پانے والا نہیں جس پر آپ کو اعتراض ہے، بلکہ مہدی

طرف نسبت مقصود ہے۔

ہارون رشیدؒ اور بہلولؒ مجنون(۱)

عبداللہ ابن مہران کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ خلیفہ ہارون رشیدؒ حج کے لیے گئے، واپسی میں کوفہ میں قیام ہوا۔ چندروز کے بعد جب وہاں سے روانگی کا ارادہ ہوا تو شہر کے لوگ مشایعت (ہم راہی) کے لیے شہر سے باہر تک آئے، جن میں بہلولؒ مجنون (مجذوب) بھی تھے۔ بہلول ٹھیک راستے میں جا بیٹھے۔ شہر کے لڑکے ان کے ساتھ تمسخر کر رہے تھے کہ اچانک ہارونؒ کی سواری قریب پہنچ گئی۔ بہلولؒ سواری کو دیکھ کر اٹھے اور آواز دی: یا امیر المومنین یا امیر المومنین!

ہارون رشیدؒ نے آواز سن کر پردہ اٹھایا اور کہا: ہاں اے بہلول! میں حاضر ہوں، کہو کیا کہتے ہو؟ بہلولؒ آگے بڑھے اور اسناد کے ساتھ حدیث پڑھی:

''ہم نے احمد ابن نابل سے سنا اور انہوں نے قدامہ ابن عبداللہؓ سے کہ وہ فرماتے تھے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عرفات سے لوٹتے ہوئے دیکھا کہ ایک ناقہ 'صہبا' پر سوار ہیں اور نہ مار پیٹ ہے اور نہ ہٹو بچو، اور اے امیر المومنین! اس سفر میں تواضع کرنا تمہارے تکبر سے بہتر ہے۔

راوی کہتا ہے کہ ہارونؒ یہ سن کر یہاں تک روئے کہ اُن کے آنسو زمین پر گرے۔ پھر کہا کہ اے بہلول! کچھ اور نصیحت کرو، خدا تم پر رحمت کرے۔ بہلولؒ نے کہا: اے امیر المومنین! ایک شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے مال اور جمال عطا فرمایا ہو پھر وہ اپنے مال میں سے خرچ کرے اور جمال میں پاک دامن رہے تو وہ خاص اللہ تعالیٰ کے دیوان میں نیکیوں کی فہرست میں لکھا جاتا ہے''۔

---

(۱) یہ عنوان حضرت مفتی صاحبؒ کے قلم سے یادگار ہے۔ (شریفی)

ہارون: آپ نے سچ فرمایا۔ پھر حکم دیا کہ بہلولؒ کو کچھ انعام دیا جائے۔

بہلول: روپیہ اس شخص کو دو جس سے تم نے وصول کیا ہے، مجھے اس کی حاجت نہیں۔

ہارون: اے بہلول! اگر تمہارے ذمے کچھ قرض ہو تو بتلاو، تا کہ ہم اُسے ادا کریں؟

بہلول: اے امیر المومنین! کوفہ کے تمام فقہا متفق ہیں کہ قرض سے قرض ادا کرنا جائز نہیں، اور تمہارے پاس جو کچھ ہے وہ تمہاری ملک نہیں بلکہ لوگوں کا مال ہے، جو تمہارے ذمے قرض ہے۔

ہارون: اے بہلول! اچھا! ہم کوئی تنخواہ مقرر کر دیں جو آپ کے لیے کافی ہو؟

بہلول آسمان کی طرف نظر اٹھا کر: اے امیر! ہم اور تم سب کے سب اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں، تو محال ہے کہ وہ تمہیں یاد رکھے اور مجھے بھول جائے؟ یہ کہا اور چل دیئے۔

سبحان اللہ! اس جنون پر لاکھوں عقلیں قربان۔ وللہ وی من قائل:۔

(احیاء العلوم: ج۲)

عشق بستان و خویشتن بہ فروش
کہ ازیں خوب تر تجارت نیست

یہ ہیں وہ لوگ جن کی دوستی اور دشمنی سب اللہ کے لیے ہے، اور یہ ہیں لا یبالون فی اللہ لومۃ لائم کے مصداق، اور یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ کے حقیقی علم بردار، جن کو حق کا کلمہ بلند کرنے میں نہ جان کی پروا ہوتی ہے اور نہ عزت و آبرو کی۔

چوں کہ امر بالمعروف اس امت مرحومہ کا مخصوص طغرائی امتیاز ہے، جس کو بار بار قرآن نے مواقع امتیاز میں بیان فرمایا ہے۔ اس لیے ہر زمانے اور ہر قرن میں

امر بالمعروف کی حامی ایک جماعت موجود ہونی چاہیے (کما سبق منا)۔

اور چناں چہ آج تک ایسا ہی ہوتا رہا ہے اور ہو رہا ہے، اور اسی لیے امر بالمعروف کے جاں باز شہدا اور جاں نثار بلاکشوں کی مقدار اس امت میں اتنی زیادہ ہے کہ اُن سب کا شمار کرنا بھی مشکل ہے۔

مضمون کی طوالت عجب نہیں کہ حد سآمۃ وملال تک پہنچ جائے۔ اس لیے بہت سے وہ واقعات بھی نظر انداز کر رہا ہوں جو اس وقت ذہن میں ہیں۔

حضرت امام احمد ابن حنبلؒ کو تکلیف:

حضرت امام احمد ابن حنبلؒ کا دردناک سانحہ اس قسم کے واقعات میں سب سے اہم اور حیرت خیز ہے، جن کو اس جرم میں کہ وہ حق کے کلمے کو بلا توریہ وتاویل صاف صاف منہ پر رکھ دیتے تھے، گرفتار کیا گیا اور وہ وہ ظلم کیے گئے کہ جن کے ذکر سے بھی جگر شق ہوتا ہے۔

جس وقت آپ کو حکم دیا گیا ہے کہ دارالخلافہ بغداد سے واسط کے جیل خانے میں منتقل کیے جائیں، آپ کے پاؤں میں چار چار بھاری بھاری لوہے کی بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں، جن سے قدم اٹھانا دشوار تھا۔ پھر اس پر یہ حکم ہوتا ہے کہ وہاں جانے کے لیے ہاتھی پر خود بلا کسی کی امداد کے سوار ہوں۔ امام ہمام نے چڑھنے کا ارادہ کیا مگر ان مصایب وآلام اور پھر ان بوجھل زنجیروں کی وجہ سے اتنی تاب کہاں تھی کہ سوار ہو سکتے؟ اُٹھنا تھا اور زمین پر گرنا۔

رمضان کا مہینہ ہے، گرمی کی چلچلاتی ہوئی دھوپ ہے اور امام ہمام روزے میں تپتی ہوئی زمین پر پڑے ہوئے ہیں، مگر ظالموں کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے امام موصوف کا اتنا جلنا کافی نہیں، حکم ہوتا ہے کہ ان کے کوڑے لگائے جائیں۔

مگر آیئے! ہم آپ کو دکھلائیں کہ اس وقت اس کوہ وقار کا کیا حال ہے؟ جب کوڑا آپ کی پشت مبارک پر پڑتا ہے تو کبھی یہ آواز زبان پر ہوتی ہے کہا القرآن کلام اللّٰہ غیر مخلوق

یہ وہی مسئلہ حق ہے جس کی وجہ سے یہ تمام مصایب جھیلے جا رہے ہیں، اور کبھی یہ کلمہ زبان سے نکلتا ہے:

لَا یُصِیْبُنَآ اِلَّا مَا کَتَبَ اللّٰہُ لَنَا (سورۂ توبہ:۵۱)

''ہمیں کوئی مصیبت نہیں پہنچ سکتی، مگر وہی جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے لکھ دی ہے۔''

روزانہ آپ کو قید سے نکالا جاتا ہے اور جلادوں کو حکم ہوتا ہے کہ آپ کی پشت پر متواتر ضربیں لگائی جائیں۔ جب یہ جلاد تھک جاے تو دوسرے تازہ دم جلادان پر مامور ہوتے ہیں۔ امام ہمام کی پشت سے خون چھوٹ رہا ہے اور سارے بدن کا یہ حال ہے:۔

محفوظ اک جگہ بھی نہیں جسم زار میں
خود بن گیا ہوں اپنا گریباں بہار میں

بے ہوش ہو جاتے ہیں، مگر جب ہوش آتا ہے تو وہی کلمہ :القرآن کلام اللّٰہ غیر مخلوق زبان پر ہوتا ہے، جس کی وجہ سے یہ سارے مصایب جھیلے جا رہے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ۔

تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوق گزیان سزا کے بعد

مگر یہ واقعہ جس قدر عبرت خیز اور اہم ہے اسی قدر مشہور و معروف بھی ہے۔ اردو زبان میں بھی بہت سے رسایل و کتب میں اس کی اشاعت ہو چکی ہے، اس لیے بہ نظر

اختصاراس واقعے کوترک کرتا ہوں اور جو واقعات اس وقت ذہن میں ہیں اُن میں سے چند بلاترتیب پیش کر کے تحریر کوختم کرتا ہوں۔ واللّٰہ الموفق!

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ حنبلیؒ:

آپ کا نام مبارک تقی الدین ہے اور ابوالعباس کنیت۔ آپ ۱۰ ربیع الاول ۶۶۱ھ (۲۲ جنوری ۱۲۶۳ء) میں اپنے وطن ''حران'' میں (جو بلاد شام میں سے ایک شہر ہے) رونق افروز عالم ہوئے۔ (اتحاف النبلاء المتقین)

یہ وہ زمانہ ہے کہ جب تاتاریوں کا طوفان مسلمانوں پر بڑھ رہا تھا۔ حران بھی ان کے خطرے سے خالی نہ رہا۔ آپ کے والد ماجد نے جب یہ دیکھا تو آپ کو ساتھ لے کر دمشق کی طرف ہجرت کی، اور اس طرح کی کہ تاتاریوں کے خوف سے رات بھر چلتے تھے اور دن کو کسی غار وغیرہ میں چھپ جاتے تھے۔ یہ پنج (پانچ) سالہ نونہال بھی اس کش مکش میں والد کے ساتھ ہے۔ راستے میں کئی مرتبہ تاتاریوں کا سامنا ہوا اور موت کا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا، لیکن خدائے قدیر کو اسی بچے کے ہاتھوں ان کو شکست دینی ہے۔ پھر کون تھا جو اُن کی طرف نظر اٹھاتا؟

بالآخر ۶۶۷ھ (۱۲۶۹ء) میں دمشق پہنچے اور وہیں اقامت اختیار کر لی، اور یہیں رہ کر اس ہونہار بچے نے بڑے بڑے علما وفضلا کی گودوں میں تربیت پائی، اور ابھی آپ سن بلوغ میں بھی نہیں پہنچے تھے کہ دنیا کا کوئی علم عقلی اور نقلی ایسا باقی نہ تھا جو ابن تیمیہؒ کے سینے میں نہ ہو اور وہ اس علم کا امام کہلانے کے قابل نہ ہو۔

آخر خدا تعالیٰ کی اس مجسم رحمت پر سترھواں سال اس شان سے شروع ہوا کہ آپ دمشق کے ایک بہت بڑے مفتی تھے۔ علمائے زمانہ آپ کے علمی تبحر اور عملی ثبات واستقامت کو دیکھ کر مشکلات میں آپ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اسی زمانے سے

تصانیف کا سلسلہ بھی شروع کر دیا، اور عقلیات و نقلیات کے ہر فن میں بے نظیر تصانیف کیں۔ سرعت تحریر کا یہ حال تھا کہ مشکل سے مشکل مسایل اور معارک (معرکے کی جمع: معارک) پر جب قلم اٹھاتے تھے تو مؤرخین لکھتے ہیں کہ چار جز روزانہ بے تامل لکھ دیتے تھے۔ پھر معلوم نہیں کہ جُز و قدماے مؤرخین کی اصطلاح میں کتنے صفحے کا ہوتا تھا؟[۱]

یہی وجہ ہے کہ آپ کی ان تصانیف کا مجموعہ جو لوگوں کے ہاتھ آئیں پانچ سو سے زیادہ ہیں۔ جن میں سے اکثر تصانیف طویل وضخیم مجلدات ہیں۔ آپ کے تھوڑے سے فتاوے جمع کیے گئے تو تیس ضخیم جلدوں میں جمع ہوے۔

درحقیقت آپ کی ذات اللہ تعالیٰ کی آیات میں سے ایک آیت (نشانی) تھی۔ اگر ایک طرف حدیث وتفسیر کے سمندر آپ کے سینے میں موج مارتے تھے، اور حافظ شمس الدین ذہبیؒ کا آپ کی شان میں یہ فرمانا بالکل صحیح تھا کہ جس حدیث کو حافظ ابن تیمیہؒ نہ جانتے ہوں وہ حدیث ہی نہیں[۲]، تو دوسری طرف علوم خلاف فلسفہ وعلم کلام

---

(۱) ہمارے زمانے میں جُز سولہ صفحے کا ہوتا ہے۔ جس زمانے میں قلمی کتابت ہوتی تھی تو کاتب اور کام کے ماہرین اس اصطلاح کو جانتے تھے۔ کاتب بتلاتا تھا "تین جز کتابت کر دیئے"۔ اگر چہ اب اس کام کے جاننے کے پہلے سے زیادہ دعوے دار ہیں، کمپیوٹر کا دور ہے، لیکن یقین ہے کہ انہیں "جُز" کا مطلب نہیں معلوم ہوگا۔ (شریفی)

(۲) یہاں ایک بات یہ بتلاتا چلوں کہ حضرت مفتی صاحب کا یہ عظیم الشان مضمون ماہ نامہ القاسم دیوبند سے ماخوذ ہے۔ اس رسالے کی فایل راقم الحروف کے پاس نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ جزاے خیر دے علم دوست اور اکابر سے عشق رکھنے والے برادرم مولانا محمد عابد صاحب حامدی حفظہ اللہ کو کہ انہوں نے استاذ محترم حضرت مولانا سید حامد میاں صاحبؒ (خلیفہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے ذاتی کتب خانے سے اس کی فایل عکس بن دا کر عطا فرمائی۔ اس میں اس مقام پر حضرت مولانا احمد رضا بجنوریؒ (داماد: حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ) کا یہ حاشیہ اپنے قلم سے لکھا ہے: "نیز یہ کہ ابن تیمیہؒ نے احادیث زیارت نبوی واحادیث توسل نبوی، ودیگر احادیث صحیحہ کو موضوع و باطل قرار دیا ہے۔ احمد رضا، بجنور، ۲۱ر مئی ۱۹۷۶ء"۔ علماے دیوبند حافظ ابن تیمیہؒ کی اس بات کو درست نہیں سمجھتے۔ (شریفی)

میں بھی اس درجے مہارت تھی کہ امام ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ "اگر ابن سینا بھی ان کے سامنے ظاہر ہوتا تو رسوائی کے سوا کوئی توشہ لے کر نہ جاتا"۔

اور اس کے ساتھ ہی اگر ایک وقت علوم و حکم کے میدان میں اُن کا قدم سب سے آگے ہوتا تھا تو دوسرے وقت جہاد و غزوات کے خوف ناک میدانوں میں بھی کوئی سپاہی آپ کی گرد کو نہ پہنچتا تھا۔

"شقحب" اور "کسروان" کی لڑائیوں میں ان کی تلوار نے جس شجاعت کا ثبوت دیا اس میں تمام بڑے بڑے شجاع سپاہی اس طرح آپ سے پیچھے تھے جس طرح علوم و حکم میں۔ تمام علمائے زمانہ سلطان، جس کے لشکر کے ایک سپاہی حافظ ابن تیمیہؒ تھے، تاتاریوں کی کثرت دیکھ کر گھبرا اُٹھا، اور مضطربانہ لہجے میں: یا خالد ابن الولید، یا خالد ابن الولید پکارنے لگا۔ شیخ الاسلام (ابن تیمیہؒ) دوڑے اور کہا کہ ہیں! یہ کیا حرکت ہے؟ یہ مت کہو بلکہ یا مالک یوم الدین ایاك نعبد و ایاك نستعین کا ورد اختیار کرو، تمہاری مدد ہوگی۔ اس کے بعد شیخ الاسلامؒ کبھی میدان کارزار میں دشمنوں کی صفوں کو چیرتے ہوئے نکلتے تھے تو کبھی سلطان اور خلیفہ کی خدمت میں آ کر ان کی ڈھارس بندھاتے تھے، یہاں تک کہ ایک مرتبہ جوش میں کہہ پڑے:

اثبت فانك منصور

"اے سلطان! تم ثابت قدم رہو، تم فتح مند ہو۔"

بعض حاضرین مجلس نے ٹوکا کہ اے ابن تیمیہ! ان شاء اللہ کہہ لو۔ ابن تیمیہؒ نے فرمایا:

ان شاء اللّٰہ تحقیقا لا تقدیرا

"ان شاء اللہ کہتا ہوں، مگر یہ ان شاء اللہ تحقیق کے لیے ہے نہ کہ تعلیق کے لیے"۔

چناں چہ خداوند عالم نے ایسا ہی کیا۔ مجھے اس وقت آپ کی سوانح لکھنی منظور نہیں، صرف تعارف کے لیے چند کلمات زبان پر آگئے۔ ورنہ اس دریاے ناپیدا کنار کے عجیب وغریب کارنامے بھی ایک دریا ہیں۔ جن لوگوں نے آپ کی سوانح کئی کئی ضخیم جلدوں میں جمع کی ہے وہ بھی آخر میں استیعاب نہ کر سکنے کا عذر کرتے ہیں۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں بھی آپ کا قدم سب سے آگے تھا، بلکہ درحقیقت خداوند عالم نے ان کو اسی لیے پیدا کیا تھا کہ وہ فتنے جو علما کی مداہنت سے اس زمانے میں پیدا ہو چکے تھے، اور وہ بدعات جو عالم اسلام میں رائج ہو چلی تھیں، ان کے سیلاب کا سینہ سپر ہو کر مقابلہ کریں، اور چناں چہ کیا اور اسی جرم میں سیکڑوں مصایب جھیلنے پڑے اور ہزاروں تکالیف شاقہ برداشت کرنی پڑیں، مگر ابن تیمیہؒ کا دم تھا کہ وہ دل میں یہ ٹھان چکے تھے:۔

موج خون سر سے گزر ہی کیوں نہ جاے
آستان یار سے اٹھ جائیں کیا؟

چوں کہ وہ کلمۂ حق کے بلند کرنے میں کسی چیز کی پرواہ نہ کرتے تھے، کوئی طمع یا خوف آپ کو حق کی آواز سے نہ روک سکتا تھا، اور:۔

چھاؤں میں وہ جا کے تلواروں کے کہہ آتے تھے حق
غالب آتا تھا نہ ان پر خوف سلطان و امیر

اسی جرم میں کئی مرتبہ سنت یوسفی ادا کرنے کی نوبت آئی اور جیل خانے میں پا بہ زنجیر رہنا پڑا۔ ایک مرتبہ شام میں ایک گنبد کے اندر قید کیے گئے۔ دوسری مرتبہ ایک کنوئیں کے اندر مقید رہے۔ تیسری مرتبہ ایک قلعے میں محبوس رہے، اور اسی میں وہ دن بھی آ پہنچا جس کے لیے یہ سارے مصایب جھیلے جاتے تھے۔ ہر مرتبہ قید سے نکلتے

تھے تو اسی نشے کا خمار اور زیادہ ہوتا تھا جس کے جرم میں یہ قید کاٹی تھی:۔

تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گناہ یاں سزا کے بعد

آخر میں جس قلعے کے اندر قید کیے گئے جب اس کے دروازے میں داخل ہوئے تو یہ آیت کریمہ زبان پر تھی:

فَضُرِبَ بَيْنَهُم بِسُورٍ لَّهُ بَابٌ بَاطِنُهُ فِيهِ الرَّحْمَةُ وَ ظَاهِرُهُ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ. (سورۂ حدید:۱۳)

''ان کے درمیان ایک چہار دیواری قایم کی گئی، جس میں ایک دروازہ ہے کہ اندر اس کے رحمت ہے اور ظاہر میں عذاب ہے۔''

خلوت، شہادت، سیاحت:

آپ کے صحیح قایم مقام اور تلمیذ رشید حافظ ابن قیم جوزیؒ ایک مرتبہ آپ سے ملنے کے لیے قلعے میں تشریف لے گئے اور اپنی پریشانی اور بے چینی ظاہر کی اور آپ کے اس ابتلا پر آب دیدہ ہونے لگے، تو فرمایا: اے عزیز! تم کچھ فکر مت کرو، کیوں کہ

انا حبسی خلوة وقتل شهادة واخراجی من بلدی سیاحة

''میں وہ ہوں کہ میرا قید خانہ میرے لیے خلوت گاہ ہے اور میرا قتل شہادت ہے اور میرا شہر بدر کرنا سیر و سیاحت ہے۔''

اور فرمایا کہ قید کرنے والوں نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔ میرے لیے قید وہ نعمت ہے کہ اگر میں اس قلعے کے برابر سونا خرچ کروں تب بھی اس کا شکریہ ادا نہ ہو، اور اے عزیز! یاد رکھو:

المحبوس من حبس عن ربه والمأسور من اسره هواه

''قیدی وہ آدمی ہے جو اپنے پروردگار سے روک دیا گیا ہو، اور مقید وہ شخص

ہے جس کو اس کی خواہشات نے مقید کر لیا ہو۔''

اب تو حقیقت کھل گئی کہ در حقیقت ہم سب قیدی ہیں۔ آزاد وہ ہی ہیں جن کو تم قیدی کہتے ہو۔ فسبحان اللّٰہ و ذلك فضل من اللّٰہ!

یہ ہے کمالِ یقین اور بشاشتِ ایمان۔ ایک مدت تک یہ قید کاٹی۔ بالآخر ۲۲ ر ذی قعدہ ۷۲۸ھ (۲۷ ر ستمبر ۱۳۲۸ء) کی شب میں خداوند عالم نے ان کو قید ظاہر اور قید حیات دونوں سے آزاد کر کے اپنے قرب کے لیے پسند فرما لیا۔

مقبولیت عامہ کا ادنا کرشمہ یہ تھا کہ جنازے میں بعض روایات کے موافق دو لاکھ آدمی شریک تھے۔ کثرت ہجوم کی وجہ سے صبح سے عصر تک بہ مشکل جنازہ قبر تک پہنچا۔ یہ ہے ان لوگوں کی عزت جو اللہ کے راستے میں اپنی عزت کی پروا نہیں کرتے اور جو سمجھتے ہیں:۔

الا رب ذُلٍ ساق للنفس عزة

و یارب نفس بالتذلل عزة

''خبردار بہت سی ذلتیں ہیں جو نفس کے لیے عزت کا ذریعہ ہوتی ہیں، اور

بہت سے نفوس ذلت سے ہی عزت پاتے ہیں۔''

شمس الائمہ سرخسی حنفیؒ:

یہ حنفیہ کے وہ امام ہمام ہیں کہ جن کی شہرت محتاج بیان نہیں۔ فقہ حنفی کی کتابیں آپ کے مقالات و روایات سے بھری ہوئی ہیں۔ آپ کے تبحر علمی کا ایک ادنا نمونہ

آپ کی تصنیف مبسوط ہے (١)، جو مبسوط و مطول ہونے میں بھی اسم با مسمی ہے، جس کی تیس جلدیں مطبوعہ مصر ہمارے سامنے ہیں۔

آپ کو خداوند عالم نے اس علمی تبحر اور عملی استقامت کے ساتھ ایک حق شناس دل اور حق گو زبان عطا فرمائی تھی، جس کو حق کے مقابلے میں کسی تکلیف اور کسی مصیبت کی پرواہ نہ تھی۔

ایک مرتبہ بادشاہِ وقت نے آپ سے اپنی خواہش کے موافق ایک فتوے پر دستخط کرنے کے لیے کہا، جو واقع میں خلاف حق تھا۔ آپ نے بلا کسی توریہ و تاویل کے مسئلۂ حق صاف صاف بیان فرما دیا۔ بادشاہ برہم ہوا اور حکم دیا کہ آپ کو ایک کنوئیں کے اندر قید کر دیا جائے۔ آپ ایک زمانے تک اُس اندھیرے کنوئیں میں مقید رہے، مگر صبر و استقامت قابل دید تھا۔

کنویں کے اندر سے تدریس اور مبسوط کی پندرہ جلدیں:

بہ حالت آزادی جس وقت جو کام کرتے تھے اس میں سر مو تفاوت نہ تھا۔ یہاں تک کہ درس و تلقین بھی جاری تھے۔ تلامذہ کنوئیں کی مَن پر آ کر بیٹھ جاتے اور امام موصوف کنوئیں کے اندر سے املا کراتے تھے۔ آپ کی مذکور الصدر کتاب "مبسوط" اسی وقت کی تصنیف ہے۔ آپ کنوئیں کے اندر سے کہتے جاتے اور شاگرد کنوئیں کی من پر لکھتے جاتے تھے۔ جس وقت آپ کی قید کی مدت پوری ہوئی تو مبسوط کی پندرہ جلدیں مکمل ہو چکی تھیں۔

---

(١) مبسوط دراصل امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہے اور یہ اس مبسوط کی شرح ہے، لیکن عرف میں عموماً شرح مبسوط کو بھی مبسوط کہا جاتا ہے۔ واللہ اعلم! (شفیع)

آپ کو کنوئیں سے نکالا گیا، ابھی اپنے گھر تک پہنچنے نہ پائے تھے کہ راستے میں ایک دوسرا استفتار دستخط کے لیے پہنچا۔ آپ نے حکم شرعی صاف صاف بیان کر دیا، اور چوں کہ یہ بھی بادشاہ وقت کی خواہش کے خلاف تھا، اس لیے بادشاہ وقت غصے سے جھنجھلا اٹھا اور حکم دیا کہ اسی وقت پھر آپ کو اسی کنوئیں میں لوٹا دیا جائے۔

پندرہ جلدیں پھر کنویں سے:

آپ نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ اس طرف ہو لیے اور فرمایا کہ بہتر ہے۔ ابھی مبسوط کا نصف حصہ باقی ہے۔ یہ بھی اسی طرح تمام ہوگا:۔

درنگ چیست اگر بامنت سر جنگ است
بہ یاکہ شیشۂ ما نیز عاشق سنگ است

چناں چہ مبسوط کی آخری پندرہ جلدیں بھی اسی شان سے پوری ہوئیں۔ شمس الائمہ نے خود بھی مبسوط کے اندر غالباً آخر کتاب ''الاقرار'' میں اس واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

انگور کے خون سے سیرابی:

اس وقت جو ناظرین کے سامنے رکھا گیا یہ سب اسلاف اُمت کے ان کارناموں کا ایک صفحہ ہے جو امر بالمعروف کے متعلق ہیں، اور ان کے ثبات و استقامت کا محض مشتے نمونہ از خروارے، ورنہ خدا جانے کتنے مبارک سر ہیں جو اس راستے میں نثار کر دیئے گئے، اور کتنی مقدس جانیں ہیں جو اسی کلمۂ حق کی بھینٹ چڑھا دی گئیں؟ اسلام کا یہ سرسبز باغ انگور کے درخت کی طرح ہمیشہ خون سے سیراب کیا گیا ہے، مگر بکرے کا نجس خون نہیں بلکہ وہ خون جس کی شان یہ ہے: ع

خونِ شہیداں راز آب اولیٰ ترست

زال دنیا (دنیا کے بڑھاپے) کے مکروفریب نے اگرچہ ہمیشہ حق کی آواز کو دبانا چاہا، مگر اس امت مرحومہ میں ہر زمانے میں ایسے حق پرست لوگ موجود رہے ہیں کہ جن کے ثبات واستقامت کے سامنے اُس کا کوئی افسوں (جادو) نہ چل سکا:

وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ (سورۂ ابراہیم:۴۶)

''اُن کا مکر ایسا نہیں تھا جس سے پہاڑ ٹل جائے۔''

زمانے کے حوادث نے ہمیشہ ہمیں گرانا چاہا مگر ہمارا حال یہ تھا:

انقلابات سے میں نے نہ کبھی لغزش کی
یاد ہے ارضِ تہامہ کو حکایت میری

ذلت اور رحمت کی وجہ:

نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان:

اعلموا ان الجنة تحت ظلال السيوف (بخاری ومسلم)

''یاد رکھو کہ جنت تلواروں کے سائے میں ہے۔''

ہمارے زیرِ نظر تھا، اور درحقیقت یہی ہماری ترقی کا زینہ اور ہمارے بہبود کا واحد طریقہ تھا، جس کی تصدیق واقعات سے ہوسکتی ہے کہ جب کبھی مسلمانوں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں سستی برتی اور مداہنت کی ان پر ذلت ورسوائی ٹوٹ پڑی، اور جب انہوں نے کلمۃ اللہ کے بلند کرنے میں استقامت سے کام لیا تو چاروں طرف سے خدا تعالیٰ کی بے انتہا رحمت نے ان کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ دنیا میں ان کی عزت ہوئی اور آخرت میں ان کے درجات بلند ہوئے۔

ہندوستان کے آخری اسلامی دور میں ظلم:

دور کیوں جائیں! ہندوستان کی سوانح (تاریخ) ہمارے سامنے ہیں۔ ایک وہ وقت تھا کہ ہندوستان کے آخری اسلامی دور میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ اس جرم میں توڑے جا رہے تھے کہ وہ ان سے حق کے بیان کرنے اور لکھنے میں مدد لیتے تھے، اور حضرت شاہ عبدالعزیز قدس سرہ کو اس جرم میں دہلی سے نکالا جا رہا تھا کہ وہ حق کو صاف صاف بیان کر دیتے تھے، اور آپ مع اپنے حرم (اہل وعیال) کے پیادہ پا دہلی سے رخصت ہو رہے تھے۔

حضرت مولانا اسماعیل شہید رحمہ اللہ کو اس خطا پر ایذائیں دی جاتی تھیں کہ وہ اظہار حق میں کسی کی پرواہ نہ کرتے تھے، اور بھی ان جیسے بہت سے پاک نفوس موجود تھے جو امر بالمعروف کے بارے میں ستائے جاتے تھے، یہ سب کچھ تھا مگر مصایب کی آندھیاں ان جبال استقامت کو اپنی جگہ سے ایک انچ نہ ٹلا سکتی تھی۔

ظالم کیوں مسلط ہوتا ہے؟

اور اسی سے اس آخری دور کا رمق باقی تھا۔ پھر جب ہندوستان ان مقدس نفوس سے خالی ہوا چاروں طرف سے فتنوں کی گھٹائیں اٹھیں اور اسی سرزمین پر برسیں۔ کھلم کھلا معاصی ہوتے اور کوئی ان پر انکار کرنے والا نہ اُٹھتا۔ جس کا لازمی نتیجہ وہ ہوا جس کو ہم آج تک بھگت رہے ہیں، اور کیوں کر نہ ہوتا؟ صادق مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی ہے کہ

عن ابن عمرؓ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لتأمرن بالمعروف وتنھون عن المنکر او لیسلطن اللّٰہ

عليكم اشراركم فيسومونكم سوء العذاب ثم يدعو خياركم فلا يستجاب لهم لتأمرون بالمعروف ولتنهون عن المنكر اوليبعثن الله عليكم من لا يرحم صغيركم ولا يؤقر كبيركم.

(رواہ ابن القیم فی الجواب الکافی: ص ۳۱ نقلاً عن ابن ابی الدنیا)

''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ یا تو تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر ایسے شریر لوگوں کو مسلط کر دے گا جو تمہیں سخت عذاب دیں گے، پھر تمہارے نیک لوگ بھی دعا کریں گے تو وہ بھی مقبول نہ ہوگی۔ بے شک! یا تو تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو ورنہ اللہ تعالیٰ تم پر ایک ایسی قوم کو بھیجے گا جو نہ تمہارے بچوں پر رحم کھائے گی اور نہ تمہارے بڑوں کی کوئی عزت رکھے گا۔''

نیز مخبر صادق فداہ ابی واُمی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم خبر دے چکے ہیں کہ

لا تزال هذا الامة تحت يد الله وفى كنفه مالم يمال قرء ها امرء ها وما لم يزك صلحاءها فجارها وما لم يهن خيارها شرادها فاذا هم فعلوا ذلك دفع الله يده عنهم ثم سلط عليهم جبابرتهم فيسومونهم سوء العذاب ثم ضربهم الله تعالىٰ بالفاقة والفقر.

(الجواب الکافی: ص ۲۸، روایۃ عن مراسیل الحسن)

''یہ امت اس وقت تک ہمیشہ اللہ کے ہاتھ کے نیچے اور اس کی پناہ میں رہے گی جب تک کہ اس کے علما امرا سے نہ کریں، اور جب تک نیک

لوگ بدوؤں (دیہاتیوں) کی تعریفیں نہ کرنے لگیں، اور جب تک بدلوگ اچھے لوگوں کی تذلیل نہ شروع کریں۔ پس جب کہ وہ ایسا کرنے لگیں تو اللہ تعالیٰ ان سے اپنا ہاتھ اٹھالیتا ہے اور پھر ان پر ان کے ظالمین کو مسلط کر دیتا ہے، جو ان کو سخت عذاب دیتے ہیں، اور پھر اللہ تعالیٰ ان پر فقر و فاقہ مسلط کر دیتا ہے۔''

قوم نے کیا کیا؟

ہندوستانیوں نے (۱) جب اپنے مذہب سے منہ موڑا، معاصی اور فواحش ان میں کھلم کھلا ہونے لگے، اور ادھر لوگوں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کو ترک کر دیا تو خداوند عالم کا غصہ ان پر قحط وغیرہ کی صورت میں ظاہر ہوا، جس نے ان کو ہر طرح تباہ و برباد کیا۔

رضائے الٰہی اور غضب کی پہچان:

کیوں کہ حضرت امام احمدؒ نے حضرت قتادہؒ سے روایت کی ہے کہ وہ نقل فرماتے تھے کہ ایک روز حضرت یونس علیہ السلام نے بارگاہ رب العزت میں عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! ہم زمین میں ہیں اور تو آسمان میں، ہمیں تیری رضا اور غصے کی پہچان کیوں کر ہو؟ بارگاہ عظمت وجلال سے جواب آیا: ''جب میں تم پر نیک لوگوں کو حاکم بناؤں تو یہ میری رضا کی علامت ہے،

اور جب شریروں اور ظالموں کو حاکم بناؤں تو یہ میرے غصے کی علامت ہے۔

(الجواب الکافی: ص ۳۱)

---

(۱) ہندوستانیوں سے مراد اس برِاعظم کے مسلمان ہیں۔ جس وقت کی یہ تحریر ہے اس وقت پاکستان، بنگلہ دیش، انڈیا سب متحدہ ہندوستان تھا۔ (شریفی)

آج جب کہ ہماری ذلت انتہا کو پہنچ چکی تو اب الحمدللہ کہ ہماری قوم میں کچھ زندگی کے آثار نمایاں ہونے لگے ہیں، اور انہوں نے پھر اپنے قدیم فریضۂ امر بالمعروف کو کچھ سنبھالا ہے، اور الحمدللہ کہ بہت سے افراد ان میں وہ بھی نکلے جن کے ثبات و استقامت نے ان کو اپنے اسلاف کا صحیح قایم مقام ثابت کر دیا۔ جنہوں نے جیل خانوں کی کوٹھریوں اور زنجیروں میں حق کی آواز بلند کی ہے۔

میری خواہش:

میرے اس مضمون کی روش چاہتی ہے کہ ان محترم بزرگوں کی سوانح بھی اس تحریر کا ایک اہم حصہ بنیں، لیکن مضمون کی طوالت کی وجہ سے متقدمین سابقین ہی کے بہت سے واقعات (جو در حقیقت اس تحریر کے لیے موضوع ہیں) مجھے چھوڑنے پڑے ہیں۔ اس لیے اس طویل و عریض میدان میں قدم رکھنا مناسب نہیں۔ بالخصوص جب کہ ان حضرات کے واقعات بہ کثرت شایع ہو چکے اور ہوتے رہتے ہیں۔ خداوند عالم ان کی سعی کو مشکور اور کامیاب فرمائے اور ہمارے ہر عمل میں اخلاص اور نیک نیتی کی روح پھونک دے۔ کیوں کہ یہی ہر عمل کا سب سے پہلا اور سب سے آخری مرحلہ ہے، اور اسی کی اصلاح سے تمام اعمال کی اصلاح اور اسی کے فساد سے فساد ہے۔ ایک بڑی سی بڑی با مشقت عبادت نیت کی خرابی سے وبال جان اور باعث عذاب ہو جاتی ہے، اور بہت سے بڑے کام نیک نیتی کی وجہ سے عبادت بن جاتے ہیں۔

خاتمہ

اسلاف کے کارنامے عزم واستقامت کی تصویر:

اسلاف امت کے کارنامے جیسے بہ اعتبار صورت عزم و استقلال ثبات و استقامت کی تصویر تھے، ایسے ہی اخلاص وصداقت اور نیک نیتی کی روح بھی رکھتے تھے، اور یہی روح تھی جو اُن کے لیے بڑی بڑی مشکلات کو آسان کر دیتی تھی۔

جس نے تجھے امیر بنایا اسی نے مجھے محتسب بنایا ہے:

احمد ابن ابراہیم مقری کا بیان ہے کہ حضرت ابوالحسین نوریؒ ایک بزرگ تھے، اکثر عزلت (تنہائی) میں رہتے تھے اور زیادہ باتیں بنانا پسند نہ کرتے تھے، لیکن حب فی اللہ اور بغض فی اللہ کا یہ حال تھا کہ خلاف شرع کسی کام کے دیکھنے کی تاب نہ لاتے تھے۔ ایک روز آپ وضو کے لیے دجلہ کے ایک گھاٹ پر بیٹھے تھے کہ اچانک ایک کشتی وہاں آ کر لگی، جس میں تیس خم (مٹکے) تھے، اور ان پر تارکول سے لفظ ''لطف'' لکھا ہوا تھا۔ حضرت ابوالحسینؒ کو یہ لفظ اوپرا معلوم ہوا، کیوں کہ تجارت کی چیزوں میں کوئی چیز ایسی نہیں تھی جس کا نام ''لطف'' ہو۔ اس لیے آگے بڑھے اور ملاح سے دریافت کیا کہ

ان میں کیا ہے؟ ملاح نے شیخ کو ٹلانا چاہا اور کہا کہ آپ کو اس سے کیا تعلق؟ آپ اپنے دھندے میں لگیں۔ یہ سن کر آپ کو اور بھی زیادہ اس کی تفتیش کی فکر ہوئی اور ملاح سے کہا کہ نہیں! تم مجھے بتلاؤ کہ ان میں کیا چیز ہے؟ ملاح نے جھنجھلا کر کہا کہ تم صوفی ہو، کیوں فضول باتوں میں اپنا وقت ضایع کرتے ہو۔ لو سنو! یہ شراب ہے۔ امیر المومنین معتضد باللہ کے یہاں جائے گی۔

شیخ ابوالحسینؒ نے جب یہ تحقیق کرلی کہ ان میں شراب ہے اور ایک مسلمان کے گھر جارہی ہے تو ملاح سے کہا کہ اچھا! ذرا اپنا ہتھوڑا ہمیں دے دو۔ ملاح نے غصے میں آکر اپنے لڑکے سے کہا: اچھا بھائی، ان کو ہتھوڑا بھی دے دو۔ دیکھیں کیا کرتے ہیں؟ جب ہتھوڑا حضرت ابوالحسینؒ کے ہاتھ میں آچکا تو فوراً کشتی پر چڑھ گئے اور تمام مٹکوں کو ایک ایک کرکے پھوڑنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ سب ختم کردیے، مگر ایک مٹکا باقی چھوڑ دیا۔ ملاح چلا رہا ہے مگر ابوالحسینؒ اس کی ایک نہیں سنتے۔ یہاں تک کہ اس پل کا چوکیدار وہاں پہنچ گیا اور اس نے آپ کو گرفتار کرکے معتضد کے دربار میں حاضر کردیا، اور معتضد کا حال یہ تھا کہ اس کی تلوار اُس کے کلام سے پہلے نکلتی تھی۔ اس وقت کسی کو اس میں شک نہیں تھا کہ معتضد آپ کو اب قتل کیا چاہتا ہے۔

حضرت ابوالحسینؒ فرماتے ہیں کہ مجھے معتضد کے سامنے حاضر کیا گیا، اس نے مجھے خطاب کرکے کہا کہ تو کون ہے؟ میں نے کہا کہ میں محتسب ہوں۔ اس نے کہا کہ تجھے محتسب کس نے بنایا؟ (کیوں کہ محتسب پادشاہ ہی کی طرف سے مقرر کیے جاتے تھے)۔ میں نے کہا کہ جس نے تجھے امیر بنایا ہے اسی نے مجھے محتسب بھی بنایا ہے۔

معتضد نے یہ سن کر سر جھکا لیا، اور کچھ دیر کے بعد کہا کہ تجھے اس حرکت پر کس چیز

نے آمادہ کیا؟ میں نے کہا کہ اس محبت وشفقت نے جو مجھے تیرے ساتھ ہے، کیوں کہ میں نے تجھے ایک گناہ سے بچالیا ہے۔ معتضد نے پھر سر جھکالیا، اور تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا۔ اس کے بعد کہا کہ اچھا! پھر یہ ایک مٹکا کیوں سالم چھوڑا؟ میں نے عرض کیا کہ اے امیر المومنین! جس وقت میں نے یہ کام شروع کیا تھا تو محض اللہ کے خوف اور اس کے حکم کی تعمیل کے لیے کیا تھا اور اسی حالت پر میں نے انتیس مٹکے توڑ دیئے۔ جب تیس ویں مٹکے کا نمبر آیا تو میں نے اپنے دل میں ایک تکبر محسوس کیا کہ آج ہم نے بڑی دلیری کا کام کیا ہے کہ ایسے جبار بادشاہ سے بھی نہیں ڈرتے؟ جب یہ خیال میرے دل میں آیا تو میں نے فوراً اپنے ہاتھ کو روک لیا، کیوں کہ اس کے بعد یہ کام خالص لوجہ اللہ نہ ہوتا۔ ورنہ پہلی حالت پر اگر ساری دنیا ان مٹکوں سے بھری ہوئی ہوتی میں بخدا ان سب کے توڑنے میں ہرگز دریغ نہ کرتا۔

جاو! ہم نے تمہیں محتسب مقرر کیا:

معتضد باللہ پر آپ کے اس اخلاص نے وہ اثر ڈالا کہ اس کا غصہ سب ٹھنڈا ہو گیا، اور اس نے مجھ سے کہا کہ جاو! ہم نے تمہیں آزاد کیا اور تم کو اختیار دیا کہ جس منکر کو دیکھو اس کو ہاتھ سے روک دو۔

اس کے بعد معتضد نے مجھ سے پوچھا کہ تمہیں کوئی حاجت ہے کہ ہم پورا کریں؟ میں نے کہا کہ بس حاجت یہ ہے کہ میں یہاں سے سلامت چلا جاوں۔ معتضد نے لوگوں کو حکم کیا کہ ان کو ان کے گھر پہنچا دیں۔

عوض سے بچنے کے لیے شہر چھوڑ دیا:

حضرت ابوالحسینؒ نے گھر پہنچتے ہی اس خیال سے کہ کہیں معتضد مجھے عطایا نہ بھیج دے جو میری اس خدمت کا عوض ہو جائے، بصرہ کا راستہ لیا اور معتضد کی حیات تک وہیں مقیم رہے۔ جب معتضد کا انتقال ہو چکا تب بغداد واپس تشریف لائے۔

کیا ہم نے جنت خرید لی؟

یہ ہیں علمائے سلف کے عجیب وغریب کارنامے اور ان کا اخلاص وصداقت، جس نے ان کے عمل کو مقبول اور کامیاب بنا رکھا تھا، اور آج جس کے قحط نے ہمارے اعمال کو تباہ کر رکھا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے اپنے عمل سے جنت خرید لی، اور درحقیقت ہماری نیت کی خرابی کی وجہ سے وہی عمل ہمیں جہنم کی طرف کھینچتا ہے۔ اعاذنا اللّٰہ منہا! کیوں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ سے ہجرت کرنے کے وقت فرمایا تھا:

> انما الاعمال بالنیات وانما لامرئ مانوی فمن کانت ھجرتہ الی اللّٰہ ورسولہ فھجرتہ الی اللّٰہ ورسولہ ومن کانت ھجرتہ الی الدنیا یصیبھا او امرأۃ یتزوجھا فھجرتہ الی ما ھاجر الیہ. (بخاری)

> ”تمام اعمال اپنی اپنی نیت کے ساتھ ہیں، اور انسان کو اس کے عمل سے وہی ملتا ہے جس کی اس نے نیت کی ہے۔ پس جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہو تو اس کی ہجرت اللہ اور رسول ہی کے لیے ہے، اور جس کی ہجرت دنیا حاصل کرنے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لیے ہو تو اس کی ہجرت اسی چیز کے لیے واقع ہوگی جس کا اس نے ارادہ کیا ہے۔“

اس لیے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اپنے سلف صالحین کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرے، اور ہر عمل سے پہلے اپنے اندر ایک اخلاص کی روح پیدا کرے، کیوں کہ

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (سورۂ بینہ:۵)

''اُن کو اس کے سوا کچھ حکم نہیں کیا گیا کہ وہ خالص اللہ کے واسطے عبادت کریں۔''

اللهم اصلح نيّاتنا واخلص اعمالنا لوجهك الكريم. اللهم لا تجعلنا من الذين حبطت اعمالهم في الحيوٰة الدنيا وهم يحسبون انهم يحسنون صنعا. اللهم وفق لنا الاستقامة في اقامة الامر بالمعروف والنهي عن المنكر. وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العٰلمين[1].

---

(۱) اللہ رب العزت کے فضل و کرم سے آج زیر نظر کتاب کی تدوین وتصحیح سے فارغ ہوا۔ اللہ تعالیٰ اسے میرے لیے باعث نجات فرمائے۔ آمین، بحق سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم!

تنویر احمد شریفی عفی عنہٗ
۱۹/رجب المرجب ۱۴۳۶ھ
۹/مئی ۲۰۱۵ء (ہفتہ)